جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

مضامینِ تدریس

عرصہ 39 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیمی سلسلہ

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد وخواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرامر (صرف ونحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری ولغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری وعملی رہنمائی
- سیرت وشمائل النبی ﷺ
- مطالعہ حدیث واصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سالِ دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان وادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصول حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

☆ آغاز رجسٹریشن 1 اگست ☆ انٹرویو 23 اگست

آغاز 24 اگست 2021 (ان شاء اللہ)

ایامِ تدریس پیر تا جمعہ

اوقاتِ تدریس: صبح 8 بجے تا 12:30

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی حضرات کے لیے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔ لہٰذا خواہشمند حضرات پہلے سے اپنی رجسٹریشن کروالیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز —— قرآن اکیڈمی

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
email:irts@tanzeem.org
www.tanzeem.org

زیر انتظام مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)
مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org
03161466611 - 04235869501-3

محرم الحرام ۱۴۴۳ھ
اگست ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دین اور مذہب میں فرق
اور سیکولرازم کی اصل حقیقت

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد : 70

شمارہ : 8

محرم الحرام 1443ھ

اگست 2021ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مُدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

ادارتی مُعاوِن:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— 5

بندۂ مؤمن کا مضبوط ترین سہارا — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ——— 9

سورۃ الواقعۃ (مکمل) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ وتبصرہ ——— 37

دین اور مذہب میں فرق

اور سیکولرازم کی اصل حقیقت — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

سیرت وسوانح ——— 71

سیرت خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ — سیّدہ حفظہ احمد

آزادئ نِسواں ——— 75

تحریکِ مساواتِ مَردوزَن: منزل بہ منزل — رضی الدین سیّد

علومِ قرآنی ——— 85

علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۳) — پروفیسر حافظ محمد قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بندۂ مؤمن کا مضبوط ترین سہارا

انسان، زندگی کے مراحل طے کرتے ہوئے اکثر اوقات فیصلہ کن موڑ پر شک وریب میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ کیا کروں؟ کیسے کروں؟ کدھر جاؤں؟ یعنی بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہوجاتا ہے۔ وہ فیصلہ کرنے میں یا اپنی راہ اور سمت متعین کرنے میں سہارا تلاش کرتا ہے۔ اُسے ذہنی اور فکری طور پر اِس یقین کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ سمجھے اور اُسے پختہ یقین ہوجائے کہ اُس نے جس راہ یا سمت کا اپنے لیے تعین کرنے کا فیصلہ کیا ہے وہ درست ہے۔ انسانوں کی اکثریت تذبذب کی حالت میں ہی زندگی گزار دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اور کائنات دونوں کے خالق نے اِس حوالے سے کوئی رہنمائی دی ہے۔ ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست قرآنِ پاک کے ذریعے اور اپنے آخری رسول ﷺ کے توسّط سے بھی بعض معاملات میں مکمل رہنمائی اور کچھ میں بنیادی اُصول فراہم کر دیتا ہے۔ گویا سادہ ترین الفاظ میں دین کا مطالعہ یہ ہے کہ انسان حق سنے اور سمجھے، حق بولے اور حق پر عمل پیرا ہو، اور پھر اِس حقیقت کو جانے کہ نتیجہ صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حق کیا اور ناحق کیا ہے؟ ایک مسلمان کے لیے سیدھی سی بات ہے، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے فرمودات، احکامات اور اُن کی ہدایات حق ہیں۔ یہی صراطِ مستقیم ہے، اِس پر پختہ عزم کے ساتھ گامزن رہے۔ دائیں بائیں مت دیکھے۔ نتیجہ جو بھی ہوگا بہترین ہوگا، چاہے فوری اور ظاہری طور پر کوئی نقصان ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ مسلمان نے تو اللہ اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہنا ہے، بلکہ ڈٹے رہنا ہے، اسے ہی توکّل کہتے ہیں۔ درحقیقت توکّل کی بنیاد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت، کوئی واقعہ، کوئی ہونی انہونی، حادثہ یا اتفاق نہیں ہوتا، بلکہ سب کچھ خالق ومالک کی طرف سے طے شدہ معاملہ ہوتا ہے۔ آیئے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جنھیں ہم حادثات سمجھتے یا قرار دیتے ہیں اُن کی حقیقت کیا ہوتی ہے۔

فزکس میں حرارت کا دوسرا قانون (2nd law of thermodynamics) بیان کرتا ہے کہ

Entropy always increases until and unless there is a force (entity) behind it.

''کسی بھی کام میں بے ترتیبی ہمیشہ بڑھتی ہی رہتی ہے، اِلا یہ کہ کوئی ہستی اس کے پیچھے کارفرما ہو۔''

یعنی جو بھی کام کسی ہستی کے منصوبہ وانتظام کے بغیر از خود حادثاتی طور پر (accidentally) اتفاقاً ہوجائے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ تخریب (destruction) کی صورت میں ہی نکلتا ہے، جبکہ کسی بھی تعمیری (constructive) کام کے لیے کسی نہ کسی ہستی کا کارفرما ہونا ضروری ہے۔ اب اس کائنات کے خود بخود حادثاتی طور پر بن جانے اور اب تک خود بخود چلتے رہنے پر ''یقین'' رکھنے والوں سے ٹریلین ڈالر کا سوال ہے کہ کیا انہوں نے کبھی کسی حادثہ کے نتیجے میں کوئی تعمیری کام ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟ اور کیا یہ کائنات تخریب کا مظہر ہے؟ عقل وفطرت کی روشنی میں مزید غور وفکر کیا جائے تو یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اس کائنات کا ایک ایک مظہر انسان کو فائدہ پہنچانے اور اس کی پرورش میں مصروف ہے۔ دن رات، سورج کی گرمی، چاند کی روشنی، بادلوں کا پھرنا، ہواؤں کا چلنا، بخارات کا اٹھنا، بارش کا برسنا، زمین کا زندہ ہونا، پھل، سبزیوں اور اناج کا اگنا اور سورج کی روشنی سے پکنا اور پھر جملہ مخلوقات کا اس پر پلنا اور انسان کا اِن اَن گنت چیزوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال میں لانا اور یوں پھلتے پھولتے پھیلتے چلے جانا۔۔۔ کیا یہ سب ایک حادثہ ہے؟ گویا زمین وآسمان اور اس کے درمیان کی ہر ہر شے حضرت انسان کے لیے ترتیب دی گئی ہے، تو کیا یہ سب خود بخود ہوگیا ہے؟ نہیں! بلکہ اس انتہائی مرتّب ومنظّم کائنات کی سب سے ظاہر وباہر حقیقت یہ ہے کہ اس کو بنانے، چلانے، ترتیب دینے، انتظام کرنے اور تھام کر رکھنے والا ہمارا ایک ''اپنا مہربان پروردگار'' ہے۔ اب اگر اس بات پر انسان کو ''یقین'' آجائے تو اس کو جو اَمن وسکون میسّر آئے گا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ جبکہ اس کے برعکس خود بخود چلنے والی دنیا میں حادثاتی طور پر آجانے والے کی حالت تو ایسی ہوگی جیسے کسی پہاڑی علاقے میں رات کے وقت تیز چلتی گاڑی میں سوئی ہوئی کسی سواری کی آنکھ کھلے اور وہ دیکھے کہ ڈرائیور گہری نیند میں سویا پڑا ہے اور گاڑی تو ''خود بخود'' چل رہی ہے۔

اب اگر کسی شخص کا ایمان ہو کہ "There are no accidents" بلکہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ الرحمٰن الرحیم، بکل شیء علیم، علیٰ کل شیء قدیر کی صفات کے حامل اور اونگھ، نیند، بھول، سمیت ہر قسم کی خامی سے پاک، اُس کے اپنے رب کے اذن سے ہوتا ہے، تو ایسے شخص کو جو پہلا ثمرہ حاصل ہوتا ہے وہ ''توکّل'' ہے جو کہ قرآن مجید کے بنیادی ترین موضوعات میں سے ہے۔ ''جو ہوتا ہے اللہ کے اذن سے ہوتا ہے'' یہ بات سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف انداز اپنائے ہیں۔ کبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھنکوا کر اسے گل وگلزار کر دیتا ہے، کبھی

یوسف علیہ السلام کو مصر میں اعلیٰ عہدہ تک پہنچانے کے لیے پہلے کنویں میں پھنکواتا ہے‘ مصر کے بازار میں غلام بنا کر بکواتا ہے‘ پھر الزام لگوا کر جیل میں بھیجتا ہے اور پھر آزادی پانے والے قیدی کو بادشاہ سے ذکر کرنا بھلوا کر اسے اس وقت یاد کرواتا ہے جب بادشاہ کو خود ضرورت پڑتی ہے اور یوں انہیں محل تک پہنچا دیتا ہے۔ کبھی موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے ان کا بچہ صندوق میں بند کروا کر دریا میں بہا دیتا ہے اور پھر فرعون کے گھر میں ہی پرورش کرواتا ہے۔ پھر پوری بنی اسرائیل کے سامنے سمندر اور پیچھے فرعون لا کر ان کے توکّل کا عظیم امتحان لیتا ہے۔ کبھی حضرت خضر سے ایک کشتی کو نقصان پہنچوا کر اسے چھن جانے سے محفوظ فرماتا ہے‘ تو کبھی والدین کے لیے کل کو پریشانی کا باعث بننے والے بچے کو مار کر انہیں بہتر بچہ عطا فرماتا ہے۔ گویا ’’کیا عجب تم کسی چیز کو ناپسند کرو جبکہ اس میں تمہارے لیے خیر ہو‘ اور تم کسی چیز کو پسند کرو جبکہ اس میں تمہارے لیے شر ہو‘ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس توکّل کے مظاہر کی معراج ہے۔ مکہ کے اس قبائلی معاشرے میں بنو ہاشم کے سربراہ کی حیثیت سے ابو طالب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تیرہ سال تک مکمل حفاظت فراہم کیے رکھی اور تین سال تک بائیکاٹ برداشت کرنے کے باوجود کسی کو قریب بھی پھٹکنے نہ دیا‘ لیکن سن دس نبوی میں ابو طالب کی وفات کے بعد دوسرے تایا ابولہب نے بنو ہاشم کا سربراہ بنتے ہی قریش کا دیرینہ مطالبہ تسلیم کر لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بنو ہاشم سے نکال دیا۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف تشریف لے گئے‘ جہاں ایک دن میں وہ کچھ ہوا جو مکہ میں تیرہ سال میں نہ ہو سکا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اَقدس کے لیے امتحان کی معراج تھی‘ لہٰذا جب آپؐ کی زبانِ مبارک پر درد بھری دعا آئی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو معراج پر بلا کر قربت کا احساس بھی دلایا اور اگلے ہی سال مدینہ منورہ کی مبارک سرزمین کا دروازہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کھول دیا۔ اسی طرح سن چھ نبوی میں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو احرام باندھے‘ قربانی کے جانور ساتھ لیے مکہ کے قریب سے واپس جانے پر مجبور کیا گیا‘ عمرہ کی اجازت نہ دی گئی اور بظاہر دب کر صلح کرنا پڑی تو اللہ تعالیٰ نے اسے ’’فتح مبین‘‘ قرار دے کر محض دو سال کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل کروا دیا۔ الغرض ہم سے مطلوب یہ ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت پر کاربند رہیں اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔

یوں تو ہر انسان کے لیے امن وسکون کا واحد ذریعہ توکّل ہی ہے‘ لیکن ایک مسلمان کے لیے اور بالخصوص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کو اپنا مشن بنا کر زندگی گزارنے کا تہیہ کرنے والے مردِ مؤمن کے لیے تو اس زندگی کی سب سے ضروری شے توکّل ہی ہے۔ یہ توکّل ہی ہے جو اُسے آج کے مادّہ

پرستانہ دَور میں ایمان بالغیب پر استقامت عطا کرے گا‘ جو اُسے آج کے معاشی اعتبار سے مشکل ترین دور میں اکلِ حلال پر اکتفا کروائے گا‘ اور جو اُسے آج کے فحش ترین دور میں جہاں زنا و اسباب وعوامل زنا کی کثرت ہو‘ صرف اپنے حلال رشتے پر اکتفا کروائے گا۔ پھر یہ توکّل ہی ہے جو تکاثر کی دوڑ کے اِس دور میں بندۂ مؤمن سے دنیا کی بجائے اللہ کی مغفرت‘ جنّت اور نیکی کے میدان میں دوڑ لگوائے گا۔ اور یہ توکّل ہی ہے جو اسے نفسانفسی کے اس دور میں اپنی ذات سے باہر نکل کر انسانی ہمدردی وخیر خواہی کے تحت دوسروں کی دنیا و آخرت کی فکر کروائے گا اور اپنا کمایا ہوا مال بھی دوسروں پر خرچ کروائے گا اور اپنا قیمتی وقت بھی دعوت وتبلیغ کے میدان میں لگوائے گا۔ اور پھر اس سے آگے بڑھ کر اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت اور بندوں کو ظلم وستم سے نجات دلا کر عدل وانصاف کے قیام کی جاں گسل جدّ وجُہد تو ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ انسان سراپا توکّل کا مظہر نہ ہو جائے۔

آج کے حالات پر نظر دوڑائی جائے تو عقلی سطح پر مسلمان کے لیے تو ہر طرف مایوسی اور اندھیرا ہی نظر آتا ہے اور دین کے غلبہ کی جدّ وجُہد کرنے والے مؤمن کے لیے تو ظاہری طور پر سراسر مایوسی ہے کہ بظاہر احوال تو وہم وگمان میں بھی کامیابی نظر نہیں آتی۔ ہر طرف کفر کا غلبہ اور مسلمانوں پر ذِلّت ومسکنت کے سائے مزید گہرے ہوتے نظر آتے ہیں‘ لیکن اگر حضورِ اَقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کو اپنا مشن بنانے والے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توکّل کو بھی اُسوۂ حسنہ قرار دے کر اس کی پیروی کریں تو پھر نورٌ علیٰ نور کی کیفیت پیدا ہو گی۔ اور قرآن پاک ہر صفحہ پر ہمیں یہ سبق یاد دلائے گا کہ تم اپنا کام کیے جاؤ اور باقی اللہ پر چھوڑ دو‘ اللہ اپنا کام خوب جانتا ہے۔ لیکن قربان جایئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ انہوں نے ہمیں یہ بھی تعلیم دی کہ توکّل کے ساتھ اونٹ کا گھٹنا باندھنا بھی انتہائی ضروری ہے‘ بیماری کے لیے دوا کا استعمال کیا جائے‘ کسبِ حلال کے لیے خوب دوڑ دھوپ کی جائے‘ دعوت کے لیے نصح وخیر خواہی کیساتھ سر توڑ کوشش کی جائے‘ اقامتِ دین کے لیے مضبوط جماعت سازی‘ تربیت وتنظیم اور صبر واستقامت میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے اور اسی طرح ملک وملت کی ترقی کے لیے تمام وسائل انتہائی خلوص اور شفافیت کے ساتھ بروئے کار لائے جائیں‘ اور دفاع کے لیے ’’وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ‘‘ کے مصداق بھرپور اسلحہ اور فوجی طاقت ہر وقت تیار رکھی جائے اور ایٹم بم بھی بنایا جائے‘ لیکن اصلاً اور حقیقتاً بھروسہ‘ اعتماد اور توکّل صرف اور صرف اللہ کی ذات پر ہو کہ شفا‘ رزق‘ ہدایت‘ قوم کی بقاو ترقی اور دین کا غلبہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن مادّی وسائل بروئے کار لاتے ہوئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے اور اس کے لیے ذہناً تیار رہنا چاہیے (باقی صفحہ 70 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْوَاقِعَۃ

تمہیدی کلمات

جیسا کہ قبل ازیں سورۃ الرحمٰن کے تمہیدی کلمات میں بھی ذکر ہو چکا ہے‘ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ اس اعتبار سے ان سورتوں کی باہمی مناسبت اور مشابہت بہت گہری ہے۔ دونوں سورتیں اس لحاظ سے پورے قرآن میں منفرد ہیں کہ ان میں نبوت‘ رسالت یا وحی کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ دونوں سورتیں اللہ تعالیٰ کی صنّاعی وخلّاقی کے تذکرے‘ جنّت و دوزخ کے احوال‘ آیاتِ انفسی وآفاقی کے بیان اور تذکیر بآلاء اللہ جیسے مضامین کی حامل ہیں۔ یہ مضامین ان دونوں سورتوں میں عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔

آیات ۱ تا ۴۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَۃُ ۙ﴿۱﴾ لَیۡسَ لِوَقۡعَتِہَا کَاذِبَۃٌ ۘ﴿۲﴾ خَافِضَۃٌ رَّافِعَۃٌ ۙ﴿۳﴾ اِذَا رُجَّتِ الۡاَرۡضُ رَجًّا ۙ﴿۴﴾ وَّبُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ۙ﴿۵﴾ فَکَانَتۡ ہَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۙ﴿۶﴾ وَّ کُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَۃً ؕ﴿۷﴾ فَاَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَیۡمَنَۃِ ؕ﴿۸﴾ وَ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَۃِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَۃِ ؕ﴿۹﴾ وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِکَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ۚ﴿۱۱﴾ فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ ؕ﴿۱۲﴾ ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ۙ﴿۱۳﴾ وَ قَلِیۡلٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ ؕ﴿۱۴﴾

عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَۃٍ ۙ﴿۱۵﴾ مُّتَّکِـِٕیۡنَ عَلَیۡہَا مُتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۱۶﴾ یَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۙ﴿۱۷﴾ بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ۙ﴿۱۸﴾ لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡہَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ۙ﴿۱۹﴾ وَ فَاکِہَۃٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ ۙ﴿۲۰﴾ وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ؕ﴿۲۱﴾ وَ حُوۡرٌ عِیۡنٌ ۙ﴿۲۲﴾ کَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُؤِ الۡمَکۡنُوۡنِ ۚ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّ لَا تَاۡثِیۡمًا ۙ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ وَ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ؕ﴿۲۷﴾ فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ۙ﴿۲۸﴾ وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ۙ﴿۲۹﴾ وَّ ظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ۙ﴿۳۰﴾ وَّ مَآءٍ مَّسۡکُوۡبٍ ۙ﴿۳۱﴾ وَّ فَاکِہَۃٍ کَثِیۡرَۃٍ ۙ﴿۳۲﴾ لَّا مَقۡطُوۡعَۃٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَۃٍ ۙ﴿۳۳﴾ وَّ فُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَۃٍ ؕ﴿۳۴﴾ اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰہُنَّ اِنۡشَآءً ۙ﴿۳۵﴾ فَجَعَلۡنٰہُنَّ اَبۡکَارًا ۙ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتۡرَابًا ۙ﴿۳۷﴾ لِّاَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ؕ﴿۳۸﴾ ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ۙ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ ؕ﴿۴۰﴾

آیت ۱ ﴿اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَۃُ ۙ﴿۱﴾﴾ ’’جب وہ ہونے والا واقعہ رونما ہو جائے گا۔‘‘

اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ ’’جب وہ وقوع پذیر ہونے والی وقوع پذیر ہو جائے گی‘‘۔ یعنی جس قیامت کی خبر تم لوگوں کو دی جا رہی ہے جب وہ آ جائے گی۔

آیت ۲ ﴿لَیۡسَ لِوَقۡعَتِہَا کَاذِبَۃٌ ۘ﴿۲﴾﴾ ’’(اور جان لو) اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔‘‘

یعنی وہ ہر صورت وقوع پذیر ہو کر رہے گی۔

آیت ۳ ﴿خَافِضَۃٌ رَّافِعَۃٌ ۙ﴿۳﴾﴾ ’’وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہوگی۔‘‘

بہت سے ایسے لوگ جو دنیا میں بہت بلند مقام و مناصب کے مالک تھے‘ قیامت انہیں ذلیل و رسوا کر دے گی۔ اس کے برعکس کئی فقراء و مساکین جن کا دنیا میں کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا‘ اس دن بہت بلند مقامات پر فائز نظر آئیں گے۔ اُس دن حضرت ابوہریرہؓ‘ حضرت ابودرداءؓ‘ حضرت ابوذر غفاری اور دوسرے فقراءِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسے اعلیٰ مراتب عطا ہوں گے جن کے بارے میں آج ہم لوگ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

آیت ۴ ﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝۴﴾ ’’جب زمین ہلا ڈالی جائے گی جیسے کہ زلزلہ آتا ہے۔‘‘

آیت ۵ ﴿وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝۵﴾ ’’اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔‘‘

آیت ۶ ﴿فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝۶﴾ ’’پس وہ ہو جائیں گے اُڑتا ہوا غبار۔‘‘

آیت ۷ ﴿وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝۷﴾ ’’اور تم تین گروہوں میں منقسم ہو جاؤ گے۔‘‘

ان تین گروہوں کا ذکر بالواسطہ طور پر سورۃ الرحمٰن میں دو جنّتوں کے حوالے سے ہوا ہے۔ یعنی اہلِ جہنّم‘ نچلے درجے کی جنّت کے مستحق اور اونچے درجے کی جنّت کے باسی۔

آیت ۸ ﴿فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝۸﴾ ’’تو جو داہنے والے ہوں گے‘ کیا خوب ہوں گے وہ داہنے والے!‘‘

داہنے والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا ہوگا —— یا تم لوگوں کو کیا معلوم کہ وہ داہنے والے لوگ کون ہوں گے‘ ان کی کیا شان ہوگی اور وہ کس کیفیت میں ہوں گے۔ مَيْمَنَة ’’یمین‘‘ سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں‘ اور ’’یُمن‘‘ سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی برکت اور خوش نصیبی کے ہیں۔ اس اعتبار سے اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَة کا ترجمہ مبارک لوگ یا خوش نصیب اور نیک بخت لوگ بھی ہو سکتا ہے۔

آیت ۹ ﴿وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝۹﴾ ’’اور جو بائیں والے ہوں گے‘ تو کیا حال ہوگا بائیں والوں کا!‘‘

مَشْئَمَة ’’شئوم‘‘ سے ہے‘ جس کے معنی بدنصیبی اور نحوست کے ہیں۔ عربوں کے ہاں جس طرح داہنی جانب خوش قسمتی اور برکت کی علامت سمجھی جاتی تھی اسی طرح بائیں جانب کو منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ان دونوں مادوں میں مستقل طور پر برکت اور نحوست کے معنی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَة کا دوسرا ترجمہ بدقسمت‘ بدبخت اور بُرے لوگ بھی کیا گیا ہے۔ اردو لفظ ’’شوم‘‘ (شومئ قسمت وغیرہ) بھی اسی سے مشتق ہے۔ بہرحال دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوگا جو دربارِ الٰہی میں بائیں جانب کھڑے کر دیے جائیں گے اور بہت بُرے انجام سے دوچار ہوں گے۔

آیت ۱۰ ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝۱۰﴾ ’’اور آگے نکل جانے والے تو ہیں ہی آگے

نکل جانے والے۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۱۱﴾ ’’وہی تو بہت مقرّب ہوں گے۔‘‘

یعنی تیسرا گروہ مقربینِ بارگاہ پر مشتمل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے قرب سے نوازنا چاہتا ہے اور اس کے لیے قرآن میں جابجا ترغیبی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ المائدۃ میں تو امر کے صیغے میں فرمایا گیا: ﴿وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾ (آیت ۳۵) کہ تم اس کا قُرب تلاش کرو اور اس کے لیے اُس کی راہ میں جہاد کرو۔ ظاہر ہے جو کوئی اللہ کی راہ میں جان و مال کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے گا اللہ تعالیٰ اُسے ضرور اپنے مقربین میں شامل فرمائیں گے۔

آیت ۱۲ ﴿فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۱۲﴾ ’’یہ نعمتوں والے باغات میں ہوں گے۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳﴾ ’’یہ بڑی تعداد میں ہوں گے پہلوں میں سے۔‘‘

آیت ۱۴ ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝۱۴﴾ ’’اور تھوڑے ہوں گے پچھلوں میں سے۔‘‘

بعض مفسّرین کے نزدیک یہاں اَوَّلِیْن سے پہلی اُمّتیں اور اٰخِرِین سے یہ اُمّت مراد ہے۔ لیکن اگر اس مفہوم کو درست سمجھا جائے تو اس سے الٹا یہ ثابت ہوگا کہ پہلی اُمّتیں اس اُمّت کے مقابلے میں بہتر اور افضل تھیں۔ اس لیے زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرے کو ہر اُمّت کے اولین اور آخرین سے متعلق سمجھا جائے۔ یعنی ہر اُمّت کے اَوَّلِیْن (ہر نبی کے ابتدائی پیروکاروں) میں سے مقربین کی تعداد زیادہ ہوگی‘ جبکہ ہر اُمّت کے اٰخِرِیْن میں سے بہت کم لوگ اس درجے تک پہنچ پائیں گے۔ اور یہی معاملہ اس اُمّت کا بھی ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((اِنَّ خَيْرَكُمْ قَرْنِيْ ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ))[1]

یعنی اس اُمّت کا بہترین زمانہ حضور ﷺ کا زمانہ تھا۔ اُس دور کے لوگ کثیر تعداد میں مقرّبین بارگاہ کے درجے تک پہنچے‘ کیونکہ جس قدر قربانیاں ان لوگوں نے دیں پچھلے زمانہ کے لوگوں نے نہیں دیں۔ تاہم یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ یعنی ہر دور میں لوگ صِدّیقین کے مقام تک بھی پہنچیں گے اور شہادتِ عظمیٰ کا درجہ بھی حاصل کریں گے‘ لیکن ان کی

۱۔ صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ ومتعدد مقامات‘ ح:۶۴۲۸‘ ۶۶۹۵۔ وصحیح مسلم‘ کتاب فضائل الصحابۃ‘ باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم‘ ح:۲۵۳۵۔ واللفظ لہ۔

تعداد بہت کم ہوگی‘ جبکہ زیادہ تر مؤمنین ’’صالحین‘‘ کے درجے تک پہنچ پائیں گے۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت سے واضح ہے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ...﴾ (آیت ۱۰۰) ’’اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے‘ اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی احسان کے ساتھ.....‘‘ یعنی ’’سابقون الاوّلون‘‘ تو آگے نکل جانے والے ہوں گے جبکہ کچھ لوگ اسی راستے پر ان کے پیچھے آنے والے بھی ہوں گے۔ یہ عام مؤمنین صالحین ہوں گے جنہیں آیات زیر مطالعہ میں اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ اور اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ کے القاب سے نوازا گیا ہے۔ چنانچہ ہر اُمّت کے پہلے دور کے اہل ایمان میں سے نسبتاً زیادہ لوگ ’’مقرّبین‘‘ ہونے کی سعادت حاصل کریں گے جبکہ بعد کے ادوار میں بہت کم لوگ اس درجہ تک پہنچ پائیں گے۔ جیسے آج حضور ﷺ کی اُمّت کی تعداد ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ ہے لیکن ان میں مقرّبین آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوں گے۔

آیت ۱۵ ۱۶ ﴿عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾﴾ ’’جڑاؤ تختوں پر‘ ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے آمنے سامنے۔‘‘

آیت ۱۷ ﴿يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’ان پر گردش کر رہے ہوں گے وہ لڑکے جو سدا اسی طرح رہیں گے۔‘‘

عام طور پر گھروں میں چھوٹی عمر کے لڑکوں کو ملازم رکھا جاتا ہے اور وہ آپ کے مزاج اور ذوق سے واقف ہو جاتے ہیں‘ لیکن بڑے ہونے پر انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر سے نکالنا پڑتا ہے۔ جبکہ جنّت میں چھوٹے لڑکے (غلمان) جو اہلِ جنّت کی خدمت پر مامور ہوں گے وہ ’’بڑے‘‘ نہیں ہوں گے بلکہ ہمیشہ لڑکپن کی عمر میں ہی رہیں گے۔

آیت ۱۸ ﴿بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾﴾ ’’آب خورے‘ صراحیاں اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے۔‘‘

اہلِ جنّت کی محفلوں میں خوبصورت غلمان نہایت شفّاف قسم کی شراب کے مینا و جام لیے ہر وقت محوِ گردش رہیں گے۔

آیت ۱۹ ﴿لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾ ’’(اس سے) نہ تو ان کے سروں

میں کوئی گرانی ہوگی اور نہ ہی وہ بہکیں گے۔‘‘

دنیا کی شراب پینے سے تو سر چکرانے لگتا ہے اور آدمی مدہوش ہو جاتا ہے‘ بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے‘ لیکن جنّت کی ’’شرابِ طَہور‘‘ کو اس شراب پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں ایسی کسی خرابی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آیت ۲۰ ﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ’’اور میوے جو وہ پسند کریں گے۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ’’اور پرندوں کے گوشت جو انہیں مرغوب ہوں گے۔‘‘

خوب صورت ابدی لڑکے یہ سب نعمتیں اہلِ جنّت کی خدمت میں پیش کر رہے ہوں گے۔

آیت ۲۲ ﴿وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾﴾ ’’اور حوریں ہوں گی بڑی بڑی آنکھوں والی۔‘‘

نوٹ کیجیے یہاں اس جنّت کی نعمتوں میں حوروں کا ذکر بھی ہوا ہے لیکن اگلی آیات میں اصحاب الیمین کی جنّت کے تذکرے میں ’’حُور‘‘ کا لفظ نہیں آیا۔ یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن میں نچلے درجے کی جنّت کا ذکر پہلے جبکہ حوروں والی جنّت (اونچے درجے کی جنّت) کا ذکر بعد میں آیا ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین کی اسی ترتیب کو میں نے ابتدا میں عکسی ترتیب (mirror image) کا نام دیا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿۲۳﴾﴾ ’’جیسے موتی ہوں چھپا کر رکھے گئے۔‘‘

آیت ۲۴ ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ’’یہ بدلہ ہوگا ان کے اعمال کا جو وہ کرتے رہے تھے۔‘‘

یہ ان قربانیوں کا صلہ ہوگا جو انہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے دی ہوں گی۔

آیت ۲۵ ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾﴾ ’’وہ نہیں سنیں گے اس میں کوئی لغوبات اور نہ ہی کوئی الزام۔‘‘

آیت ۲۶ ﴿اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾﴾ ’’مگر (ان کے لیے‘ ہر طرف سے) سلام سلام ہی کی آوازیں ہوں گی۔‘‘

یہ تو تھا مقربین اور ان کی جنّت کا بیان‘ اب آگے اصحاب الیمین اور ان کی جنّت کا ذکر ہے۔

آیت ۲۷ ﴿وَاَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ﴿۲۷﴾﴾ ’’اور اصحاب الیمین! کیا کہنے ہیں اصحاب الیمین کے!‘‘

آیت ۲۸ ﴿فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ﴿۲۸﴾﴾ ’’وہ ہوں گے بیری کے درختوں میں جن میں کانٹے نہیں ہوں گے۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۲۹﴾﴾ ’’اور تہ برتہ کیلے۔‘‘

آیت ۳۰ ﴿وَّ ظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ﴿۳۰﴾﴾ ’’اور پھیلے ہوئے سائے۔‘‘

آیت ۳۱ ﴿وَّ مَآءٍ مَّسۡکُوۡبٍ ﴿۳۱﴾﴾ ’’اور بہتا ہوا پانی۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿وَّ فَاکِهَةٍ کَثِیۡرَةٍ ﴿۳۲﴾﴾ ’’اور کثرت کے ساتھ میوے۔‘‘

آیت ۳۳ ﴿لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَةٍ ﴿۳۳﴾﴾ ’’نہ ٹوٹے ہوئے اور نہ ہی پہنچ سے باہر۔‘‘

جنّت کے پھل درختوں سے توڑ کر انہیں پیش نہیں کیے جائیں گے بلکہ جب وہ پھل حاصل کرنا چاہیں گے درخت خود ان کے سامنے جھک جائیں گے۔ تمام پھل بکثرت بے روک ٹوک ملیں گے۔ کوئی پھل ایسا نہیں ہوگا جو اُن کی پہنچ سے باہر ہو یا اسے کھانا ممنوع قرار دیا گیا ہو۔

آیت ۳۴ ﴿وَّ فُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ ﴿۳۴﴾﴾ ’’اور اونچے اونچے بچھونے۔‘‘

آیت ۳۵ ﴿اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً ﴿۳۵﴾﴾ ’’ان (کی بیویوں) کو اٹھایا ہے ہم نے بڑی اچھی اُٹھان پر۔‘‘

آیت ۳۶ ﴿فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡکَارًا ﴿۳۶﴾﴾ ’’پس ہم نے بنایا ہے انہیں کنواریاں۔‘‘

آیت ۳۷ ﴿عُرُبًا اَتۡرَابًا ﴿۳۷﴾﴾ ’’پیار دینے دلانے والیاں‘ ہم عمر۔‘‘

آیت ۳۸ ﴿لِّاَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۳۸﴾﴾ ’’(یہ سب کچھ ہوگا) اصحاب الیمین کے لیے۔‘‘

آیت ۳۹ ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۹﴾﴾ ’’جو پہلوں میں سے بھی بہت ہوں گے۔‘‘

آیت ۴۰ ﴿وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۴۰﴾﴾ ’’اور پچھلوں میں سے بھی بہت ہوں گے۔‘‘

اب اس کے بعد اہلِ جہنّم کا تذکرہ ہے۔

آیات ۴۱ تا ۵۶

وَ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ؕ ﴿۴۱﴾ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ۙ﴿۴۲﴾ وَّ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ۙ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ﴿۴۴﴾ اِنَّهُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ ۚ﴿۴۵﴾ وَ کَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ ۚ﴿۴۶﴾ وَ کَانُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ ۙ اَئِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ﴿۴۷﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۴۸﴾ قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِیۡنَ وَ الۡاٰخِرِیۡنَ ۙ﴿۴۹﴾ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ ۙ اِلٰی مِیۡقَاتِ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ اِنَّکُمۡ اَیُّهَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُکَذِّبُوۡنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰکِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ ۙ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ۚ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوۡنَ عَلَیۡهِ مِنَ الۡحَمِیۡمِ ۚ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوۡنَ شُرۡبَ الۡهِیۡمِ ؕ﴿۵۵﴾ هٰذَا نُزُلُهُمۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ؕ﴿۵۶﴾

آیت ۴۱ ﴿وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾﴾ ’’اور بائیں والے! کیا (ہی بُرا) حال ہوگا بائیں والوں کا!‘‘

آیت ۴۲ ﴿فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ﴿۴۲﴾﴾ ’’وہ ہوں گے تیز لُو اور کھولتے ہوئے پانی میں۔‘‘

آیت ۴۳ ﴿وَّ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ﴿۴۳﴾﴾ ’’اور کالے دھوئیں کے سائے میں۔‘‘

آیت ۴۴ ﴿لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ﴿۴۴﴾﴾ ’’نہ وہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ ہی سکون بخش۔‘‘

آیت ۴۵ ﴿اِنَّهُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ ﴿۴۵﴾﴾ ’’یہ لوگ اس سے پہلے (دنیا میں) بڑے خوشحال تھے۔‘‘

دنیا میں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسّر تھا۔ وہاں انہوں نے خوب مزے کیے۔

آیت ۴۶ ﴿وَ کَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۴۶﴾﴾ ’’اور یہ اصرار کرتے تھے بہت بڑے گناہ پر۔‘‘

بہت بڑے گناہ سے یہاں شرک مراد ہے‘ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۃ النساء میں حتمی فیصلہ دیا جا چکا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِهٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ (آیت ۴۸ و۱۱۶) کہ اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ کیے گئے شرک کو کبھی نہیں بخشے گا‘اس کے علاوہ جس کسی کو جو چاہے گا بخش دے گا۔

آیت ۴۷ ﴿وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۥ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ’’اور وہ یہ کہا کرتے تھے کہ کیا جب ہم مرجائیں گے اور ہو جائیں گے مٹّی اور ہڈیاں تو کیا پھر سے اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟‘‘

آیت ۴۸ ﴿اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾﴾ ’’اور کیا ہمارے آباء و اجداد بھی جو پہلے گزر چکے ہیں؟‘‘

آیت ۴۹ ﴿قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ’’(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) آپ کہیے کہ یقیناً پہلے بھی اور پچھلے بھی۔‘‘

آیت ۵۰ ﴿لَمَجْمُوْعُوْنَ ۥ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾﴾ ’’لازماً جمع کیے جائیں گے‘ایک مقرّر دن کے طے شدہ وقت پر۔‘‘

آیت ۵۱ ﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ’’پھر تم‘ اے گمراہو اور جھٹلانے والو!‘‘

آیت ۵۲ ﴿لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾﴾ ’’ضرور کھاؤ گے زقوم کے درخت سے۔‘‘

تم بھٹکے ہوئے تھے‘ ہم نے تمہاری راہنمائی کے لیے اپنا رسولﷺ بھیجا‘ کتاب ہدایت بھیجی: ﴿تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۸﴾﴾ (قٓ) یہ سب کچھ تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے تھا۔ لیکن اس کے باوجود تم نے ہمارے رسولﷺ کو بھی جھٹلا دیا‘ ہماری کتاب کی بھی تکذیب کی اور گمراہ رہنے کو ہی ترجیح دی۔ تو اے بھٹکے ہوئے اور ہماری ہدایت کو جھٹلانے والے لوگو! اب جہنّم کے اندر تمہاری ضیافت زقّوم کے درخت سے ہی کی جائے گی۔ (۲)

۲۔ زقّوم کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
((لَوْ اَنَّ قَطْرَةً مِنَ الزَّقُّوْمِ قُطِرَتْ فِيْ دَارِ الدُّنْيَا لَاَفْسَدَتْ عَلٰى اَهْلِ الدُّنْيَا مَعَايِشَهُمْ فَكَيْفَ بِمَنْ يَكُوْنُ طَعَامَهُ)) (سنن الترمذی‘کتاب صفة جهنم‘باب ماجاء فی صفة شراب اهل النار)

آیت ۵۳ ﴿فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ’’پس اسی سے تم اپنے پیٹ بھرو گے۔‘‘

آیت ۵۴ ﴿فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾﴾ ’’پھر پیو گے اس پر کھولتا ہوا پانی۔‘‘

آیت ۵۵ ﴿فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾﴾ ’’اور ایسے پیو گے جیسے پیاس کا مارا اونٹ پیتا ہے۔‘‘

جس طرح پیاس زدہ اونٹ جلدی جلدی اپنے پیٹ میں پانی بھرتا چلا جاتا ہے تم بھی وہ کھولتا ہوا پانی اسی طرح اپنے پیٹوں میں بھرو گے۔

آیت ۵۶ ﴿هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ’’یہ ہو گی اُن کی ابتدائی ضیافت جزا کے دن۔‘‘

یہاں پر ان تینوں گروہوں کا بیان مکمل ہو گیا۔ یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن میں جہنّم اور جنّت کے حوالے سے ان تینوں گروہوں کا تذکرہ سورۃ کے آخر میں آیا تھا‘ جبکہ یہاں ان کا ذکر سورت کے آغاز میں آیا ہے۔ یعنی دونوں سورتوں کے مضامین معکوس ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ اسی عکسی ترتیب کے تحت اب سورت کے دوسرے رکوع میں وہ مضمون آ رہا ہے جو سورۃ الرحمٰن کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی خلاقی اور صنّاعی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان بنائے‘ زمین بنائی‘ زمین میں دریا چلائے‘ سمندر پھیلائے۔ دریاؤں اور

’’اگر زقّوم کا ایک قطرہ بھی دنیا میں ٹپکا دیا جائے تو دنیا والوں کے لیے ان کی زندگی برباد کر دے‘ تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جن کی غذا ہی یہی ہو گی!‘‘

’’زقّوم‘‘ صحرائے عرب کا ایک درخت ہے‘ جس کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:
’’زقّوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزہ اس کا تلخ ہوتا ہے‘ بو ناگوار ہوتی ہے اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔‘‘ (تفہیم القرآن‘ جلد ۴‘ ص ۲۸۹)
اس کے بارے میں مفتی محمد شفیعؒ رقم طراز ہیں:
’’بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سانپ بچھو وغیرہ دنیا میں بھی ہوتے ہیں اسی طرح دوزخ میں بھی ہوتے ہیں‘ لیکن دوزخ کے سانپ بچھو یہاں کے سانپ بچھوؤں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوں گے‘ اسی طرح دوزخ کا زقّوم بھی اپنی جنس کے لحاظ سے تو دنیا ہی کے زقّوم کی طرح ہو گا‘ لیکن یہاں کے زقّوم سے کہیں زیادہ کریہہ المنظر اور کھانے میں کہیں زیادہ تکلیف دہ ہو گا‘ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم!‘‘ (معارف القرآن‘ جلد ۷‘ ص ۲۴۱)

سمندروں کی تہوں میں عجیب وغریب قسم کے موتی اور مونگے پیدا کیے اور پہاڑوں جیسے بڑے بڑے جہازوں کا پانی کی سطح پر تیرنا ممکن بنایا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی شان اور اُس کی قدرتوں کے مظاہر ہیں۔ چنانچہ اسی انداز سے یہاں اس سورت میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور صنّاعی کا ذکر ہونے جارہا ہے‘ لیکن پے در پے سوالات کے ساتھ بہت ہی خوبصورت اور مؤثّر انداز میں:

آیات ۵۷ تا ۷۴

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْ لَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾
ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ
الْمَوْتَ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ
نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْ
لَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ
اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ
تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَيْتُمُ
الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ
نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾
اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ
نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾
فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

آیت ۵۷ ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾﴾ ’’ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے‘ تو تم لوگ تصدیق کیوں نہیں کرتے؟‘‘

جب یہ تسلیم کرتے ہو کہ تم سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو پھر تم لوگوں کو یہ یقین کیوں نہیں آتا کہ وہی اللہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کرسکتا ہے۔ اس میں آخر تعجب اور شک والی کون سی بات ہے؟

آیت ۵۸ ﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ ’’کیا تم نے کبھی غور کیا اس پر جو (منی) تم ٹپکا دیتے ہو؟‘‘

آیت ۵۹ ﴿ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ ’’کیا اس کی تخلیق تم کرتے ہو یا ہم تخلیق کرنے والے ہیں؟‘‘

تم تو پانی کی وہ بوند ٹپکا کر فارغ ہوجاتے ہو۔ اس کے بعد رحمِ مادر میں ایک حیرت انگیز تخلیقی عمل کا آغاز ہوجاتا ہے۔ وہ نطفہ عَلَقَہ میں تبدیل ہوتا ہے‘ عَلَقَہ سے مُضغہ بنتا ہے۔ پھر ہڈیاں بنتی ہیں‘ جوڑ بند درست ہوتے ہیں‘ آنکھوں‘ کانوں اور دوسرے اعضاء کا نقشہ تیار ہوتا ہے اور یہ سارا عمل تین پردوں ﴿فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾ (الزمر:۶) کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ کیا اس سارے عمل میں تمہارا بھی کوئی حصّہ ہے؟ ماں کے پیٹ میں مختلف پیچیدہ تخلیقی مراحل سے گزرتے ہوئے بچے کے کسی عضو کے بنانے میں کیا کوئی تمہارا کردار بھی ہے؟ یا اس کی تذکیر و تانیث میں تمہارا کچھ اختیار ہے؟ ظاہر ہے اس پورے تخلیقی عمل میں تمہارا حصّہ یا کردار بالکل نہیں ہے‘ اور تم تسلیم کرتے ہو کہ نہیں ہے‘ تو پھر اس حقیقت کو قبول کیوں نہیں کر لیتے ہو کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی و منشاء اور صنّاعی و خلّاقی کا مظہر ہے۔

جب ہم ان آیات کی تلاوت کریں تو ہر سوال کے جواب میں عجز و انکساری سے عرض کرنا چاہیے: بَلْ اَنْتَ یَارَبِّ! کہ اے میرے پروردگار! یہ سب تیری کاریگری‘ تیری صنّاعی اور تیری خلّاقی کا مظہر ہے‘ اس میں سے ہمارے بس میں کچھ بھی نہیں۔ (تفسیرِ عثمانی کے مطابق بعض روایات کی بنا پر علماء نے یہ مستحب سمجھا ہے۔)

آیت ۶۰ ﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ﴾ ’’ہم نے تمہارے مابین موت کو ٹھہرا دیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری مثل بدل کر لائیں‘‘

یہ مقام بھی مشکلات القرآن میں سے ہے۔ بہرحال اس کی ایک توجیہہ جو میری سمجھ میں آتی ہے‘ وہ یہ ہے کہ یہاں دو انسانی زندگیوں اور ان کے درمیان طے شدہ موت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ایک دنیا کی زندگی ہے اور دوسری آخرت کی زندگی اور درمیان میں اللہ تعالیٰ نے موت کا پردہ حائل کر دیا ہے۔ موت کی اس سرحد کے اس طرف بھی تم ہو اور دوسری طرف بھی تم ہو۔ گویا موت کے وقفے کے بعد زندگی کا تسلسل پھر سے بحال ہوجائے گا۔ بقول میرؔ ؎

موت اِک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

یہاں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم تو مٹّی میں مل کر مٹّی ہو جاتا ہے‘ جبکہ اس کی روح کو موت نہیں آتی‘ روح زندہ رہتی ہے۔ قیامت میں انسان کو جس جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جائے گا وہ بعینہٖ اس کا دنیا والا جسم نہیں ہوگا‘ بلکہ ’’اس جیسا‘‘ جسم ہوگا۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ انسان کا دُنیوی زندگی والا جسم تو اس زندگی میں بھی مسلسل بدلتا رہتا ہے۔ زندہ جسم کے اربوں خلیے مسلسل ختم ہوتے رہتے ہیں اور ایسے ہی نئے خلیے مسلسل بنتے رہتے ہیں۔ جِلد کی جھلی بھی بدلتی رہتی ہے اور ناخن بھی لگاتار گھستے اور نئے بنتے رہتے ہیں۔ اس عمل کو ذہن میں رکھیں تو یہ حقیقت بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ایک انسان کا چند سال پہلے جو جسم تھا آج اس کا جسم وہ نہیں ہے اور جو جسم اس کا آج ہے چند سال بعد بعینہٖ یہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ جب انسان کا جسم مسلسل تبدیل ہو رہا ہے تو آخرت میں اسے بعینہٖ دنیا والا جسم ملنا ویسے ہی بعید از قیاس ہے۔ اگر وقتی طور پر یہ فرض کر لیا جائے کہ انسان کو آخرت میں دنیا والا جسم ملے گا تو پھر اس سوال کا جواب بھی دینا پڑے گا کہ وہ اس کا کون سا جسم ہوگا؟ بیس برس کی عمر والا؟ چالیس سال کی عمر والا؟ یا ساٹھ سال کی عمر والا؟ لہٰذا یہ بات عقل اور منطق ہی کے خلاف ہے کہ انسان کو دوبارہ دنیا والے جسم کے ساتھ زندہ کیا جائے گا۔

چنانچہ آخرت میں انسان کو دنیا کے جسم جیسا جسم دیا جائے گا اور اس کی روح کو اس کے اس جسم سے ملا کر اسے نئی زندگی بخشی جائے گی۔ یہ مضمون قرآن میں تین مقامات (بنی اسرائیل:۹۹‘ یٰسٓ:۸۱‘ الدھر:۲۸) پر آیا ہے۔ بہرحال دوبارہ زندہ ہونے کے بعد انسان کی جان اور روح جب نئے جسم میں منتقل ہو جائے گی تو اس کے شعور اور اس کی یادداشت کا دنیوی تسلسل بعینہٖ بحال کر دیا جائے گا۔ دنیا میں وہ کیا تھا؟ وہاں اُس نے کب کیا کیا تھا؟ زندہ ہوتے ہی اسے سب کچھ یاد آ جائے گا۔ کیونکہ دُنیوی زندگی کے دوران اس کا جسم تو بدلتا رہا تھا لیکن اس کے شعورِ ذات کا تسلسل بغیر کسی خلل کے آخر تک برقرار رہا تھا۔ اس لیے وہ سلسلہ موت کے باعث جہاں سے ٹوٹا تھا عین وہیں سے اسے جوڑ دیا جائے گا۔ چنانچہ ان آیات کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ اے لوگو! تمہاری دو زندگیوں کے درمیان ہم نے ہی موت کا پردہ حائل کر رکھا ہے‘ تو کیا ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ تم جیسے وجود دوبارہ پیدا کر دیں۔

﴿وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾﴾ ’’اور تمہیں ایسی تخلیق میں اٹھائیں جسے تم نہیں جانتے!‘‘

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ تمہیں ہم ایسے عالَم میں اٹھا کھڑا کریں گے جس کی کیفیت سے آج تم واقف نہیں ہو یعنی عالَمِ آخرت میں۔

آیت ۶۲ ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى﴾ ’’اور تم (اپنی) پہلی زندگی کے بارے میں تو جانتے ہی ہو‘‘

یعنی اپنی دنیوی تخلیق سے متعلق تمام مراحل کے بارے میں تو تم جانتے ہو۔ انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر قرآن مجید میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے‘ سورۃ المؤمنون کی یہ آیات اس موضوع پر قرآن کے ذروۂ سنام کا درجہ رکھتی ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿١٢﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿١٣﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿١٤﴾﴾

’’ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹّی کے خلاصے سے۔ پھر ہم نے اسے بوند کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو عَلَقَہ کی شکل دے دی‘ پھر عَلَقہ کو ہم نے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر ہم نے گوشت کے اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں‘ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا‘ پھر ہم نے اسے ایک اور ہی تخلیق پر اٹھا دیا۔ پس بڑا بابرکت ہے اللہ‘ تمام تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والا۔‘‘

تو جب اس حیرت انگیز اور پیچیدہ تخلیقی عمل کے مختلف مراحل تمہارے علم اور مشاہدے میں آ چکے ہیں:

﴿فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾﴾ ’’تو پھر تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟‘‘

تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ تم اس سے نصیحت اور یاددہانی کیوں اخذ نہیں کرتے؟

—— اللہ تعالیٰ کی قدرت اور صنّاعی کے ان مظاہر کا ادراک کر لینے کے بعد بھی تمہیں یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ جس اللہ نے اس عمل سے گزار کر ہمیں ابتدا میں پیدا کیا ہے وہ دوبارہ بھی ہمیں پیدا کر سکتا ہے؟

آئندہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی خلّاقی کی چند اور مثالیں بیان کی جا رہی ہیں:

آیت ۶۳ ﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿٦٣﴾﴾ ’’کیا تم نے کبھی غور کیا کہ یہ بیج جو تم بوتے ہو؟‘‘

تم لوگ تو بیج کو مٹّی میں دبا کر آ جاتے ہو۔ اس کے بعد تم کیا جانو کہ وہ بیج کس کس مرحلے سے گزرتا ہے‘ کس طرح اس کی جڑیں نکل کر زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور کس طرح اس کی کونپلیں زمین کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہیں!

آیت ۶۳ ﴿ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ ’’کیا تم اسے اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں؟‘‘

یہاں ہماری زبانوں پر بے اختیار یہ الفاظ آجانے چاہئیں: بَلْ اَنْتَ یَارَبِّ! کہ نہیں! اے ہمارے پروردگار! اسے تُو ہی اُگاتا ہے‘ اس میں ہمارا کچھ بھی اختیار نہیں! علامہ اقبال کی نظم اَلْاَرْضُ لِلّٰہ کے درج ذیل اشعار میں ان ہی آیات کے اسلوب اور مضمون کی جھلک نظر آتی ہے: ؎

پالتا ہے بیج کو مٹّی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے‘ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں‘ تیری نہیں!
تیرے آباء کی نہیں‘ تیری نہیں‘ میری نہیں!

یعنی یہ زمین‘ یہ کائنات‘ کائنات کا پورا نظام یہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے اور اسی کی قدرت و مشیت سے اس کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔

آیت ۶۵ ﴿لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا﴾ ’’اگر ہم چاہیں تو اسے چُورا چُورا کر دیں‘‘

اگر ہم چاہیں تو کسی آسمانی آفت‘ طوفان‘ جھکّڑ یا ژالہ باری سے تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری لہلہاتی فصلوں کو برباد کر کے رکھ دیں۔

﴿فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾﴾ ’’پھر تم بیٹھے رہو باتیں بناتے ہوئے۔‘‘

آیت ۶۶ ﴿اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾﴾ ’’(کہ لو جی!) ہم پر تو بڑا تاوان پڑ گیا۔‘‘

کہ ہم نے محنت کی‘ ہل چلائے‘ بیج ڈالا‘ آبیاری کی اور بہت سے دوسرے اخراجات کیے‘

لیکن ہم پر تو اُلٹی چٹّی پڑ گئی۔

آیت ۶۷ ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾﴾ ’’بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم ہو کر رہ گئے۔‘‘

ہمارا تو سب کچھ برباد ہو گیا۔

آیت ۶۸ ﴿اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾﴾ ’’کبھی تم نے غور کیا کہ وہ پانی جو تم پیتے ہو؟‘‘

آیت ۶۹ ﴿ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾﴾ ’’کیا بادلوں سے تم نے اسے برسایا ہے یا ہم ہیں برسانے والے؟‘‘

آیت ۷۰ ﴿لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا﴾ ’’اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا کر دیں‘‘

﴿فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾﴾ ’’تو تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟‘‘

آیت ۷۱ ﴿اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾﴾ ’’کبھی تم نے سوچا کہ وہ آگ جو تم جلاتے ہو؟‘‘

آیت ۷۲ ﴿ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾﴾ ’’کیا اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے‘ یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟‘‘

بَلْ اَنْتَ یَارَبِّ! نوٹ کیجیے پے در پے سوالات کا یہ تیکھا اسلوب پورے قرآن میں اور کہیں نہیں ہے۔

آیت ۷۳ ﴿نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾﴾ ’’ہم نے بنا دیا اس کو ایک نشانی یاد دلانے کو اور ایک بہت فائدہ مند چیز صحرا کے مسافروں کے لیے۔‘‘

جیسا کہ سورۂ یٰسین کی آیت ۸۰ کے ضمن میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے‘ بعض صحراؤں میں ایسے درخت پائے جاتے ہیں جن کی سبز گیلی شاخوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پر شَجَرَتَهَآ سے وہ مخصوص درخت بھی مراد ہے اور عام درخت بھی۔ کیونکہ درختوں کی لکڑی آگ جلانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اور یہ درخت ظاہر ہے اللہ نے پیدا کیے ہیں اور اُسی نے ان میں جلنے کی خصوصیت رکھی ہے۔

آیت ۷۴ ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾﴾ ’’پس تم تسبیح بیان کرو اپنے ربّ کے نام کی جو بہت عظمت والا ہے۔‘‘

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ!

اب اگلی آیات میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے۔ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے عظمتِ قرآن کے حوالے سے سورۃ الرحمٰن کے آغاز کی یہ عظیم آیات بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ﴿۴﴾﴾ قرآن کی عظمت کے اس بیان کے بین السطور میں یہ پیغام بھی مضمر ہے کہ انسانوں پر اس عظیم کتاب کا حق ادا کرنا لازم ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کا یہ فرمان بھی ہم ان آیات کے ضمن میں پڑھ آئے ہیں: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) کہ تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو خود قرآن سیکھتے اور دوسروں کو سکھاتے ہیں۔ ان دونوں سورتوں کے مضامین چونکہ عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں‘ اس لیے عظمت قرآن کا وہ مضمون جو سورۃ الرحمٰن کے آغاز میں آیا تھا‘ اس سورت کے آخر میں آ رہا ہے اور سورۃ الرحمٰن کی مذکورہ چار آیات کے مقابلے میں یہاں اس موضوع پر آٹھ آیات آئی ہیں۔

آیات ۷۵ تا ۸۲

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ﴿۷۷﴾ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾

آیت ۷۵ ﴿فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾﴾ ”پس نہیں! قسم ہے مجھے اُن مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔“

بعض مفسّرین نے مَوٰقِعِ النُّجُوم کی وضاحت شہابِ ثاقب کے حوالے سے کی ہے‘ حالانکہ شہابِ ثاقب بالکل مختلف چیز ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اسے شیاطین کو عالمِ بالا سے مار بھگانے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ موجودہ دور میں سائنس کی فراہم کردہ معلومات کی مدد سے اس آیت کو نسبتاً بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے‘ اگرچہ ابھی بھی اس کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ حلال و حرام‘ جائز و ناجائز‘ فرائض اور دین کے عملی پہلو سے متعلق قرآنی احکام کی تفہیم و تعمیل کے حوالے سے ہمیں راہنمائی کے لیے ”دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو!“ کے مصداق پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہیے۔ اس ضمن میں ہماری نظری و عملی اطاعت کا کمال یہ ہوگا کہ ہم اپنے اسلاف کا دامن تھامے رکھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اتباع کو لازم جانیں۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے خود کو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں پہنچا دیں‘ بقول اقبال: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

البتہ دوسری طرف کائنات کی تخلیق‘ کائنات میں زندگی کی ابتدا‘ تاریخی حوالہ جات اور سائنس کے مختلف شعبوں سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح و تعبیر کے لیے ہمیں ہر دور کے اجتماعی انسانی شعور اور دستیاب حقائق و معلومات کو مدِّنظر رکھنا چاہیے‘ پھر جہاں مناسب معلوم ہو ان معلومات سے استفادہ بھی کرنا چاہیے اور جب ممکن نظر آئے تکلّف سے اجتناب کرتے ہوئے فطری انداز میں قرآنی الفاظ و معانی کا زمینی حقائق کے ساتھ تطابق ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ ایسی آیات کا جو مفہوم آج سے ہزار سال پہلے سمجھا گیا تھا آج ہم اس مفہوم کو ماننے اور درست جاننے کے پابند نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایسی آیات کا تعلق حکمت سے ہے‘ کسی حکم سے نہیں ہے۔ چنانچہ حکمت اور سائنس کے میدان میں تو نئے نئے افق تلاش کرنے کے لیے مستقبل کی طرف دیکھنا چاہیے‘ لیکن احکام اور دین کے عملی پہلو کو سمجھنے‘ سمجھانے کے لیے ماضی سے تعلق جوڑنے اور حضور ﷺ کے فرمان مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ کو مشعلِ راہ بنائے رکھنے کی ضرورت ہے۔

اب آیئے آیت زیر مطالعہ کو موجودہ دور کی سائنسی معلومات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ موجودہ دور میں سائنس دانوں نے کائنات کے اندر ایسے بے شمار بڑے بڑے اندھے غاروں کا کھوج لگایا ہے جو اپنے پاس سے گزرنے والی ہر چیز کو نگل جاتے ہیں۔ سائنس دانوں نے ان ”غاروں“ کو Black Holes کا نام دیا ہے۔ ایسے کسی ایک بلیک ہول کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے ستارے

پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتے ہیں' بلکہ ایسے کروڑوں ستاروں پر مشتمل کہکشائیں بھی ایسے بلیک ہولز کے اندر گم ہو کر معدوم ہو جاتی ہیں۔ سائنسی تحقیقات سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ کائنات کے اندر مسلسل نئے نئے ستارے جنم لے رہے ہیں اور نئی نئی کہکشائیں وجود میں آ رہی ہیں' جبکہ ساتھ ہی ساتھ بے شمار کہکشائیں اپنے اَن گنت ستاروں کے ساتھ مسلسل بلیک ہولز کی نذر ہو کر معدوم ہو رہی ہیں۔ اگرچہ کائنات کے اسرار و رموز سے متعلق آج بھی انسان کی معلومات بہت محدود ہیں لیکن پھر بھی بلیک ہولز کے متعلق اب تک حاصل ہونے والی یہ معلومات بہت ہوشربا ہیں۔

اب اگر ہم اپنی زمین کی جسامت اور وسعت کا نقشہ ذہن میں رکھیں' پھر اس کے مقابلے میں سورج کی جسامت کا اندازہ کریں' پھر یہ تصوّر کریں کہ کائنات میں ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے اربوں کھربوں ستارے بھی موجود ہیں اور ان ستاروں کے درمیان اربوں نوری سالوں کے فاصلے ہیں' پھر یہ تصوّر کریں کہ ایسے اَن گنت ستاروں پر مشتمل اَن گنت کہکشائیں ہیں' اور ان کہکشاؤں کے درمیانی فاصلے بھی اسی تناسب سے ہیں۔ کہکشاؤں اور ستاروں سے متعلق یہ تمام معلومات ذہن میں رکھ کر اگر ہم کائنات کے طول و عرض میں موجود لاتعداد بلیک ہولز کا تصوّر کریں اور پھر یہ نقشہ ذہن میں لائیں کہ ان میں سے ایک ایک بلیک ہول اتنا بڑا ہے کہ وہ اپنے پاس سے گزرنے والی کسی بڑی سے بڑی کہکشاں کو آنِ واحد میں ایسے نگل جاتا ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا اور پھر ان بلیک ہولز کا اطلاق مَوٰقِعِ النُّجُوْم پر کریں تو شاید ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہو جائے کہ اس آیت میں جس قسم کا ذکر ہوا ہے وہ کتنی بڑی قسم ہے۔

آیت ۷۶ ﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝۷۶﴾ ''اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو!''

یعنی ابھی تم مَوٰقِعِ النُّجُوْم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ایک وقت آئے گا جب تمہیں ان کی حقیقت سے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں گی' پھر تمہیں احساس ہوگا کہ ہم نے تمہارے سامنے یہ کس قدر عظیم قسم پیش کی ہے۔

آیت ۷۷ ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝۷۷﴾ ''یقیناً یہ بہت عزّت والا قرآن ہے۔''

یہاں پر ہم میں سے ہر شخص کو پوری دیانت داری سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے اپنی حد تک قرآن مجید کی کیا قدر کی ہے اور کس حد تک اس کے حقوق پورے کیے ہیں؟ بہرحال جہاں

تک ان حقوق کی ادائیگی کا تعلق ہے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر کسی انسان کو ہزاروں زندگیاں مل جائیں اور وہ انہیں ''قرآن'' کے لیے وقف کر دے' تب بھی قرآن کا حق ادا نہیں ہو سکے گا۔

آیت ۷۸ ﴿فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝۷۸﴾ ''ایک چُھپی ہوئی کتاب میں۔''

یہ قرآن کریم ایک پوشیدہ کتاب میں محفوظ ہے۔ سورۃ الزخرف کی آیت ۴ میں اس کِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ کو اُمِّ الْكِتٰب کا نام دیا گیا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۴﴾ ''اور یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس بہت بلند و بالا' بہت حکمت والی!'' جبکہ سورۃ البروج میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝۲۱ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝۲۲﴾ ''بلکہ یہ قرآن عظیم الشان (کتاب) ہے۔ لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا)۔''

آیت ۷۹ ﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝۷۹﴾ ''اسے چھو نہیں سکتے مگر وہی جو بالکل پاک ہیں۔''

یعنی اسے فرشتے ہی چھو سکتے ہیں جو بالکل پاک مخلوق ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی عظمت کے ضمن میں سورۂ عبس میں فرمایا گیا ہے: ﴿كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۱۲ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝۱۳ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝۱۴ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝۱۵ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ۝۱۶﴾ ''ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پس جو کوئی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو باعزّت ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں۔ ایسے کاتبوں کے ہاتھوں میں ہیں جو معزز اور نیک ہیں۔''

آیت زیر مطالعہ میں الْمُطَهَّرُوْنَ سے مراد فرشتے ہیں اور يَمَسُّهٗ میں ہٗ کی ضمیر کا تعلق ''كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ'' سے ہے۔ مَوٰقِعِ النُّجُوْم کی قسم کا مُقسَم علیہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت باعزّت اور برتر کلام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک محفوظ کتاب میں ہے' جس تک اُس کے پاک فرشتوں کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں۔ یعنی اس کو صرف ملائکہ مقرّبین ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں' جنّات اور شیاطین وہاں پھٹک بھی نہیں سکتے۔

فقہاء نے اس آیت سے یہ حکم بھی استنباط کیا ہے کہ قرآن مجید کو ناپاکی کی حالت میں چھونے کی اجازت نہیں ہے۔ اس بارے میں فقہاء کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو چھونے اور چھو کر پڑھنے کے لیے وضو ضروری ہے' جبکہ زبانی تلاوت بغیر وضو بھی کی جا سکتی ہے' البتہ جنابت کی حالت میں قرآن مجید کے الفاظ کو زبانی پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ قرآن کے اصل لُبِّ لُباب تک پہنچنے اور اس کی ہدایت سے مستفیض ہونے کے لیے باطنی صفائی ضروری ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے قرآن کے ظاہر اور باطن کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس طرح ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں پڑھتے ہیں: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید:۳) ''کہ وہ اوّل بھی ہے' آخر بھی ہے' ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے''۔ اسی طرح قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ قرآن کا ظاہر اس کی عبارت اور اس کے الفاظ ہیں۔ جہاں تک قرآن کے اس ظاہر کا تعلق ہے ہر عربی دان شخص اس کے معانی و مطالب کو سمجھ سکتا ہے اور اس کی صَرف و نحو پر بحث کرسکتا ہے۔ اس اعتبار سے کئی ایسے غیر مسلموں کی مثالیں بھی موجود ہیں جنہوں نے عربی میں مہارت حاصل کر کے قرآن کے تراجم کیے اور تفسیریں لکھیں۔ لیکن ایسے لوگ قرآن کے باطن تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ اقبال نے اسی مفہوم میں ایسی ہی بات بندۂ مؤمن کے بارے میں کہی ہے:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے !

اقبال نے اس شعر میں بندۂ مؤمن کے وجود کے مرکز کا ذکر کیا ہے۔ بالکل اسی مفہوم میں قرآن مجید کا بھی ''مرکز'' ہے۔ قرآن کے مرکز سے مراد اس کی روح باطنی' اس کی ہدایت' اس کا اصل علم اور اس کا لُبِّ لُباب ہے۔ اس لحاظ سے آیت زیر مطالعہ اس حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ قرآن مجید کے مرکز (nucleus) تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تزکیۂ باطنی ضروری ہے۔ اس تزکیۂ باطنی کا ذکر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا میں بھی ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۲۹)

''پروردگار! ان لوگوں میں اٹھائیو ایک رسول خود انہی میں سے جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے۔''

یہاں پر یہ نکتہ لائقِ توجّہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اس دعا میں تعلیمِ کتاب و حکمت کا ذکر پہلے کیا اور تزکیہ کو آخر پر رکھا' لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے سے ان ہی چار امور

کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو ترتیب بدل دی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تین مقامات (البقرۃ:۱۵۱' آل عمران:۱۶۴' الجمعۃ:۲) پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ان ذِمّہ داریوں کا ذکر کیا اور تینوں مقامات پر تزکیہ کا ذکر تعلیمِ کتاب و حکمت سے پہلے کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن مجید کی روحِ باطنی تک رسائی کا طالب ہو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے دل کو تکبّر' حسد' حُبِّ دُنیا سمیت تمام خباثتوں سے پاک کرے' ورنہ قرآن مجید کا نُور اس کے باطن میں کبھی سرایت نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کا اصل فہم اس پر کبھی منکشف ہوگا' اگرچہ بظاہر وہ قرآن کا بہت بڑا مفسّر ہی کیوں نہ بن جائے۔ تزکیۂ باطن کے حوالے سے یہاں سورۂ یونس کی آیت ۵۷ کا پیغام بھی ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کو انسانی دل کی تمام باطنی اَمراض کے لیے شفا قرار دیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷﴾

''اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے اَمراض) کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔''

آیت ۸۰ ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۰﴾ ''اس کا اُتارا جانا ہے ربّ العالمین کی جانب سے۔''

اور اس کے بعد اب یہ چبھتا ہوا سوال (piercing question) پوچھا جا رہا ہے:

آیت ۸۱ ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝۸۱﴾ ''تو کیا تم لوگ اس کتاب کے بارے میں مداہنت کر رہے ہو؟''

اس آیت کا مفہوم ہمیں تب سمجھ آئے گا جب ہم میں سے ہر ایک خود کو اس کا مخاطب سمجھے کہ یہ آیت براہِ راست اس سے پوچھ رہی ہے کہ اے اللہ کے بندے! کیا تم اپنے دُنیوی معاملات و مفادات کو اللہ کی اس نعمت کے مقابلے میں ترجیح دے رہے ہو؟ کیا تم اس عظیم کتاب کو سیکھنے سکھانے اور سمجھنے میں سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کر رہے ہو؟ ذرا سوچو تو! تم نے کیسے کیسے مشکل علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ ان علوم کو سیکھنے کے لیے تم نے کیسی کیسی محنت کی ہے اور کتنا وقت کھپایا ہے! اس کے مقابلے میں قرآنی زبان سیکھنے کے لیے تم نے کتنی کوشش کی ہے؟ تو کیا تم

نے اپنی دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس قدر عظیم نعمت کو پسِ پشت ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

آیت ۸۲ ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۝۸۲﴾ ''اور تم نے اپنا نصیب یہ ٹھہرا لیا ہے کہ تم اس کو جھٹلا رہے ہو!''

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی یاد رکھیں کہ قرآن کا جھٹلانا ایک تو زبانی ہے اور دوسرا عملی۔ زبانی اور نظریاتی طور پر تو قرآن مجید کو مشرکینِ عرب جھٹلاتے تھے یا ہر زمانے کے بہت سے غیر مسلم جھٹلاتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود محمد (ﷺ) کی تصنیف ہے۔ جبکہ عملی طور پر اسے ہم مسلمان جھٹلاتے ہیں۔ ہم نظریاتی طور پر تو اسے اللہ کا کلام مانتے ہیں اور زبان سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر اس کے احکام ماننے سے کھلم کھلا اعراض کرتے ہیں۔ ہماری اس کیفیت کی مثال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے حوالے سے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ﴾ (الجمعۃ:۵) کہ جو لوگ حاملِ تورات بنائے گئے اور پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا' ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔ اگر آپ ایک گدھے پر مکالماتِ افلاطون اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تمام جلدیں لاد دیں تو ان کتابوں کو اٹھا لینے سے وہ ان کا عالم تو نہیں بن جائے گا۔ اس آیت کی روشنی میں یہودیوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیں تو انہوں نے زبان سے کبھی تورات کی تکذیب نہیں کی' بلکہ وہ ابھی تک اسے اپنے سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید نے مذکورہ آیت میں ان کی جس تکذیب کا ذکر کیا ہے وہ عملی تکذیب ہے۔ بالکل اسی طرح ہم بھی آج قرآن مجید کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں' لیکن عملی طور پر اس کے احکام کی تعمیل سے روگردانی کر کے مذکورہ بالا مثال کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق تو ہمارے اس طرزِ عمل سے قرآن مجید پر ہمارے زبانی ایمان کی بھی تکذیب ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهُ))(۳) ''جس نے قرآن کی حرام کردہ اشیاء کو اپنے لیے حلال ٹھہرا لیا اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں۔''

قرآن مجید کی اس عملی تکذیب کے علاوہ آج ہم مسلمان اس کی ''تکذیبِ حالی'' کے بھی

۳۔ سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فیمن قرأ حرفًا من القرآن ماله من الاجر' ح:۲۹۱۸۔ والمعجم الاوسط للطبرانی: ۳۳۷/۴۔

مرتکب ہو رہے ہیں۔ تکذیبِ حالی یہ ہے کہ کسی شخص کا حال اس حقیقت کی گواہی دے رہا ہو کہ اس کے نزدیک فلاں چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن مجید کے حوالے سے اپنی تکذیبِ حالی کو سمجھنے کے لیے آپ اپنے ہاں کے ایک عام ڈاکٹر کی مثال لے لیں۔ اس نے رات دن ایک کر کے پچیس سال کی عمر میں ایم بی بی ایس کیا۔ پھر FRCS کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ امریکہ گیا' وہاں جا کر امتحان دیا۔ وہاں کے بورڈز سے یہ ڈپلومہ' وہ ڈپلومہ.....! اس پڑھائی میں اُس نے اپنی زندگی کے پینتیس چالیس سال کھپا دیے۔ اس کے بعد وہیں ملازمت اختیار کر لی..... یا واپس آ کر اپنی ملازمت اور پریکٹس میں کولہو کے بیل کی طرح جُت گیا۔ مشن کیا ہے؟ معاش اچھی ہو جائے اور معیارِ زندگی بلند ہو جائے! یہ مشن تو اُس نے حاصل کر لیا' لیکن اپنی زندگی کے ماہ وسال میں سے اُس نے قرآن مجید سیکھنے کے لیے کوئی وقت نکالا اور اس کے لیے کوئی محنت کی؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو اس کا حال گویا چیخ چیخ کر گواہی دے رہا ہے کہ اس شخص کی زندگی میں قرآن مجید کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے بارے میں یقین نہیں۔

یاد رہے کہ سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیات میں قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کی ترغیب مثبت انداز میں دلائی گئی تھی' جبکہ یہاں سورۃ الواقعہ کے اختتام پر اسی ترغیب کے لیے منفی انداز اپنایا گیا ہے۔ یعنی سورۃ الرحمٰن کی چار ابتدائی آیات کے بین السطور میں یہ پیغام مضمر تھا کہ اگر رحمٰن نے اپنا کلام ''قرآن'' تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہیں ''بیان'' کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے تو تمہاری اس طلاقتِ لسانی کا بہترین اور لازمی مصرف یہی ہے کہ تم اس صلاحیت کو قرآن کے لیے وقف کر دو۔ جبکہ یہاں سورۃ الواقعہ کی ان آیات میں یہ تنبیہہ مضمر ہے کہ جو لوگ قرآن کے حقوق کما حقہٗ ادا نہیں کرتے آخرت میں انہیں اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا اور کوتاہی ثابت ہونے پر ان کی سخت گرفت ہوگی۔

آیات ۸۳ تا ۹۶

فَلَوْلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ۝۸۳ وَ اَنْتُمْ حِيْنَىِٕذٍ تَنْظُرُوْنَ۝۸۴ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ۝۸۵ فَلَوْلَاۤ اِنْ كُنْتُمْ

غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ
مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَاَمَّآ اِنْ
كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾ وَ
اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۹۳﴾ وَ
تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ
رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾

جیسا کہ قبل ازیں بھی بار بار ذکر ہوا ہے کہ سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ باہم جوڑا ہیں اور ان کے مضامین بھی باہم مشابہ و مربوط ہیں۔ البتہ زیر مطالعہ آیات کا مضمون صرف اسی سورت میں آیا ہے۔ اس کے مقابل سورۃ الرحمٰن میں ایسا کوئی مضمون نہیں ہے۔ گویا یہ مضمون اس سورۃ کی اضافی شان ہے۔

آیت ۸۳ ﴿فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾﴾ ''تو کیوں نہیں' جب جان حلق میں آ (کر پھنس) جاتی ہے۔''

آیت ۸۴ ﴿وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾﴾ ''اور تم اُس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو۔''

ان آیات میں ایک انسان کے وقتِ نزع کی کیفیت کا عبرت انگیز نقشہ پیش کر کے دعوتِ فکر دی گئی ہے کہ ذرا سوچو! جب تم میں سے کسی کی جان حلق میں پھنسی ہوتی ہے۔ تم اُس وقت کا تصوّر کرو جب تم میں سے کسی کے بیٹے' کسی کے بھائی' کسی کے والد' کسی کی والدہ یا کسی کی بیوی پر نزع کا عالَم طاری ہوتا ہے اور وہ بے بسی کی تصویر بنے اپنے اس عزیز کی اس کیفیت کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

آیت ۸۵ ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''اور ہم تمہارے مقابلے میں اس سے قریب تر ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں پاتے۔''

یہ تو تخصیص کے ساتھ عالَمِ نزع کی کیفیت کا ذکر ہے' لیکن اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر بندے کے ساتھ ہوتا ہے' جیسا کہ سورۂ قٓ میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ

حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہم تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں۔''

آیت ۸۶ ۸۷ ﴿فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''تو اگر تم کسی کے اختیار میں نہیں ہو' تو اس (جان) کو لوٹا کیوں نہیں لیتے اگر تم سچّے ہو؟''

یہاں الفاظ کی ترتیب اس طرح ہے کہ ان دونوں آیات کو ملانے سے ایک فقرہ مکمل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے خصوصی اسلوب کی وجہ سے لَوْلَا پہلی آیت کے شروع میں آ گیا ہے' لیکن اس کا مفہوم دوسری آیت کے ساتھ ملنے سے واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ مفہوم کی وضاحت کے لیے یوں سمجھیں کہ ان دونوں آیات میں الفاظ کی اصل ترتیب یوں ہے: فَاِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ' لَوْلَا تَرْجِعُوْنَهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ؟ کہ تم لوگ آئے دن اپنے عزیز و اقارب کی اموات کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو تم سب مل کر بھی اور اپنے تمام وسائل استعمال میں لا کر بھی اس کو بچا نہیں پاتے ہو۔ اس معاملے میں تمہارے بڑے بڑے صاحبِ اختیار و اقتدار لوگ بھی بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ شاہی اطباء اور ماہر ڈاکٹرز کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور بادشاہ سلامت ان کی آنکھوں کے سامنے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ تم لوگ دعویٰ کرتے ہو کہ تم خود ہی پیدا ہوتے ہو اور خود ہی مرتے ہو اور تمہاری زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچّے ہو تو اپنے پیاروں کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر بے بسی کی تصویر بن کر کیوں رہ جاتے ہو؟ اپنے وسائل کو استعمال میں لا کر انہیں بچا کیوں نہیں لیتے ہو؟

اس کے بعد اگلی آیات میں ان تین گروہوں کی جزا و سزا کا تذکرہ ہے جن کا ذکر سورۃ کے آغاز میں ہوا تھا۔

آیت ۸۸ ﴿فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''پھر اگر وہ مقرّبین میں سے تھا۔''

یعنی اگر مرنے والا شخص سابقون میں سے تھا۔ اپنی زندگی میں ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ﴾ (المائدۃ:۴۸) کے حکم پر عمل کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مسابقت کرتے ہوئے دوسروں کے لیے مثال بنتا رہا تھا:

آیت ۸۹ ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾﴾ ''تو اُس کے لیے راحت اور

سرور اور نعمتوں والی جنّت ہے۔''

آیت ۹۰ ﴿وَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ۙ﴿۹۰﴾﴾ ''اور اگر وہ اصحابُ الیمین میں سے تھا۔''

اگرچہ وہ ''سابقون'' میں سے تو نہیں تھا لیکن نیک تھا اور دین کی خدمت میں حسبِ استطاعت کوشاں رہتا تھا:

آیت ۹۱ ﴿فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ؕ﴿۹۱﴾﴾ ''تو سلامتی پہنچے آپ کو اصحابُ الیمین کی طرف سے۔''

اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ اطمینان رکھیں کہ آپ کی اُمّت کے اصحابُ الیمین بھی عیش میں ہوں گے اور جنّت کی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے جن کا ذکر سورۃ کے آغاز میں ہو چکا ہے۔(۴)

آیت ۹۲ ﴿وَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ ۙ﴿۹۲﴾﴾ ''اور اگر وہ تھا جھٹلانے والوں اور گمراہوں میں سے۔''

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجّہ ہے کہ قبل ازیں دوسرے رکوع میں جب اس گروہ کا ذکر ہوا تو وہاں ان لوگوں کو ''اَيُّهَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُكَذِّبُوۡنَ'' کہہ کر مخاطب فرمایا گیا تھا' لیکن یہاں پر انہیں ''الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ'' کہا گیا ہے۔ یعنی یہاں پر الفاظ کی ترتیب بدل گئی ہے۔ بظاہر اس کی توجیہہ یہ سمجھ آتی ہے کہ سزا کے حوالے سے ان کے بڑے اور اصل جرم کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ حق کو جھٹلا دینے کے مقابلے میں گمراہی نسبتاً چھوٹا جرم ہے' کیونکہ کسی گمراہ اور بھٹکے ہوئے شخص کو اگر کوئی سیدھا راستہ دکھا دے تو ممکن ہے وہ اسے قبول کر لے' لیکن جو حق کو جھٹلا دے اس کا سیدھے راستے پر گامزن ہونا ممکن نہیں۔

آیت ۹۳ ﴿فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ۙ﴿۹۳﴾﴾ ''تو اُس کے لیے مہمانی ہے کھولتے پانی سے۔''

۴۔ اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ اصحابِ یمین کی طرف سے اُس کا استقبال کیا جائے گا اور اُسے سلام کہا جائے گا۔ جب کہ بعض مفسّرین نے اس جملے میں اَنْتَ محذوف مانا ہے۔ یعنی تقدیرِ عبارت یوں ہے: فسلم لک انت من اصحٰب الیمین کہ تیرے لیے اب سلامتی ہی سلامتی ہے' تُو اصحابِ یمین میں شامل ہے! (حاشیہ از مرتّب)

آیت ۹۴ ﴿وَّتَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ ؕ﴿۹۴﴾﴾ ''اور جہنّم میں جلنا۔''

یعنی ان لوگوں کی ابتدائی تواضع تو کھولتے ہوئے پانی سے ہوگی۔ اس کے بعد ان کو جہنّم کے اصل عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

آیت ۹۵ ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الۡيَقِيۡنِ ۚ﴿۹۵﴾﴾ ''یقیناً یہ سب کچھ قطعی حق ہے۔''

بے شک یہ ساری باتیں سچّی اور یقینی ہیں۔ یہ سب تفصیلات جو اس سورت میں بیان ہوئی ہیں ان کے بارے میں تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ ہو کر رہنا ہے۔ قیامت کے دن تمام نوعِ انسانی کو مذکورہ بالا تین گروہوں میں تقسیم کر کے ہر گروہ کے افراد کو ان کے اعمال و اعتقادات کے مطابق بدلہ دیا جانا ہے۔

آیت ۹۶ ﴿فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ؕ﴿۹۶﴾﴾ ''پس آپ تسبیح کیجیے اپنے رب کے نام کی جو کہ بہت عظمت والا ہے۔''

اس کے جواب میں امتثالِ امر کے طور پر کہا جائے گا: سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ! یہ آیت اس سورت میں دو مرتبہ آئی ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ((اِجْعَلُوْهَا فِيْ رُكُوْعِكُمْ))(۵) کہ اس کو تم لوگ اپنے رکوع میں رکھ دو۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس فرمان کے مطابق رکوع کی تسبیح سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ اس آیت سے اخذ کی گئی ہے۔

۵۔ سنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب ما یقول الرجل فی رکوعہ وسجودہ' ح:۸۶۹ وصحیح ابن حبان' ح: ۱۸۹۸ —— اسی طرح جب آیت ﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى ۙ﴿۱﴾﴾ (الاعلیٰ) نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ((اِجْعَلُوْهَا فِيْ سُجُوْدِكُمْ)) کہ اس کو تم لوگ اپنے سجدوں میں رکھ دو۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

دین اور مذہب میں فرق اور سیکولرازم کی اصل حقیقت

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۱۸/ اکتوبر ۱۹۹۱ء کا خطابِ جمعہ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رَسولہِ الکریم ... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہِ من الشَّیطٰن الرَّجیم - بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾﴾ (آل عمران)

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ

وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۗ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾﴾ (آل عمران)

تفہیمِ آیات

سورۂ آل عمران کے ان دونوں مقامات پر ایک عظیم حقیقت بیان فرما دی گئی‘ جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اصلاً دین ہے‘ صرف مذہب نہیں۔ لیکن یہ عظیم حقیقت موجودہ دَور میں سمجھنا اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے‘ اس لیے کہ موجودہ دور کے کچھ اپنے تصوّرات ہیں جن سے مسلمان بھی بحیثیت مجموعی محفوظ نہیں ہیں۔ اس کی تفصیل اِن شاء اللہ آگے آ جائے گی۔

ان دونوں مقامات پر اسلام کا جو تذکرہ ہوا ہے‘ ایک جگہ ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ﴾ اور دوسری جگہ اسی کا معکوس (converse) ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ تو دراصل بات ایک ہی ہے۔ بیان کرنے کا ایک مثبت انداز ہے۔ یعنی ”بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے“ یا ”بے شک اللہ کے نزدیک اسلام دین ہے“۔ یہ دونوں ترجمے مستعمل ہیں۔ یہی بات دوسرے مقام پر منفی انداز میں سامنے آ رہی ہے۔ یعنی ”جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا تو اُس سے یہ قبول نہیں کیا جائے گا۔“ اللہ تعالیٰ اُسے قبول نہیں فرمائے گا۔ اس کا یہ مفہوم بھی از خود ہے کہ جو اسلام کو سوائے دین کے کسی اور حیثیت میں قبول کرے گا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہوگا۔

مندرجہ بالا چاروں مفاہیم کی روشنی میں تفصیلی گفتگو سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ متذکرہ بالا آیات کا ایک رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں۔ آیت ۱۸ میں ایک عظیم حقیقت بیان ہو رہی ہے اور وہ ہے توحید۔ توحید کے ایک پہلو کا تعلق تو عقیدہ سے ہے‘ یعنی توحید فی الذّات اور توحید فی الصّفات‘ جو اصلاً ایک علمی معاملہ ہے۔ توحید کا دوسرا گوشہ جو توحید فی العبادات اور توحید فی الحاکمیت پر مشتمل ہے‘ یہی درحقیقت توحیدِ عملی ہے۔ لہٰذا فرمایا:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ...﴾ ''اللہ خود گواہ ہے اس پر کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' اس کے سوا کوئی مالک نہیں' کوئی حاکم نہیں' کوئی قانون عطا کرنے والا نہیں۔ الٰہ کے مفہوم میں یہ تمام گوشے شامل ہیں۔ ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ ''اور (اس پر گواہ ہیں) تمام فرشتے اور اصحابِ علم بھی۔'' یعنی جو عقل مند انسان اپنی صحیح فطرت پر قائم ہے وہ بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ ﴿قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ''(اللہ) قائم کرنے والا ہے عدل و انصاف کا۔'' دُنیا میں بظاہر اگر کچھ تاخیر ہو جائے تو ہم خیال کرنے لگتے ہیں کہ شاید یہاں ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' والا معاملہ ہے' لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ بالآخر یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا عدل نافذ ہو کر رہتا ہے' جبکہ آخرت میں تو اس کے عدل و قسط کا ظہور اپنی آخری اور تکمیلی شکل میں ہو کر ہی رہنا ہے۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ زبردست کمالِ حکمت والا ہے۔''

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ﴾ اب یہ اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ ''اللہ کے نزدیک دین تو بس (ایک ہی ہے اور وہ) اسلام ہے۔'' اسلام کے معنی ہیں گردن جھکا دینا' سرِ تسلیم خم کر دینا' سپر انداختن۔ اب جبکہ وہی مالک ہے تو اُس کی اطاعت بھی لازم ٹھہری۔ لہٰذا نہ کوئی اُس کا مدِّمقابل بن سکتا ہے اور نہ ہی اُس کی حاکمیت کے سامنے کسی اور کی حاکمیت کا ڈھنڈورا پیٹا جا سکتا ہے۔ وہ ہمارا معبود اور ہم اُس کے عبد ہیں۔ وہ ہمارا مالک اور ہم اس کی ملکیت ہیں۔ وہ ہمارا حاکم اور ہم اُس کے محکوم ہیں۔ ان تینوں چیزوں کو جمع کر لیجیے تو یہی درحقیقت اسلام کا تصوّر ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک واحد مقبول اور پسندیدہ طریقِ زندگی صرف اسلام ہے' اور یہ دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى...﴾ (الشوریٰ:۱۳) ''ہم نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی تاکید ہم نے نوحؑ کو کی تھی' اور جس کی وحی ہم نے (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) آپ کی طرف کی ہے' اور جس کی تاکید ہم نے ابراہیمؑ' موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھی کی تھی۔'' لہٰذا دین میں تو کوئی فرق نہیں۔ یہ دینِ اسلام تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ تفرقے کہاں سے پیدا ہو گئے؟ یہ یہودیت اور مسیحیت کہاں سے آ گئی؟ لہٰذا ساتھ ہی اس کی وجوہ بھی بیان فرما دیں: ﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ﴾ ''اور (اِس دین سے) اختلاف نہیں کیا اُن لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی' مگر اس کے بعد کہ اُن کے پاس علم آ چکا تھا' آپس کی ضد اور حسد سے۔'' حقیقی علم اور اصل ہدایت اُن کے پاس آ چکی تھی' لیکن آپس کی ضِدّم ضِدّا اور ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کی خواہش (the urge to dominate) اس تفرقے کا سبب بن گئی اور یوں اصل دین سے کئی شاخیں نکل آئیں۔ ایک شاخ دین سے علیحدہ ہوئی تو یہودیت بن گئی۔ اسی دین سے دوسری شاخ نکلی تو عیسائیت وجود میں آ گئی۔ حالانکہ دین تو ایک ہی ہے آدمؑ سے ایں دم۔ ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرے تو (وہ جان لے کہ) اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن نشانیاں آ جانے کے بعد بھی اگر لوگ اُسی کفر اور غلط روش پر اَڑے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔

﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ﴾ ''پھر بھی (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) اگر یہ آپ سے جھگڑا کریں (حُجّت بازی یا دلیل بازی کریں) تو کہہ دیجیے کہ مَیں نے تو اپنا رُخ اپنے پروردگار کی طرف کر لیا ہے (سرِ تسلیم خم کر دیا ہے) اور میرے ساتھ جو میرا اتباع کرنے والے ہیں (انہوں نے بھی یہی روش اختیار کر لی ہے)۔'' اب تم جانو تمہارا کام۔ ہم نے تو دین اسلام عملاً قبول کر لیا ہے۔ یہ وہ اعلانِ براءت ہے جس کی نمایاں ترین صورت قرآن حکیم میں بایں الفاظ سامنے آتی ہے: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۳﴾﴾ (الکٰفرون) ''کہہ دو کہ اے کافرو! میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو' نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔''

﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ﴾ ''اور (آپؐ) کہہ

دیجیے اہلِ کتاب سے اور اُمّیین سے کہ کیا تم نے بھی (اُسی کی) اطاعت و بندگی قبول کی؟'' ﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ﴾ ''پھر اگر وہ بھی اسلام لے آئیں (اور اسی طرح سرِتسلیم خم کردیں) تو وہ بھی ہدایت پر آجائیں گے۔'' انہیں ہدایت پر آنے کے لیے کوئی کوہِ ہمالیہ سر نہیں کرنا' بس اپنی ضد اور سرکشی چھوڑنی ہے اور اللہ کے مدِمقابل بننے کے دعوے سے دست بردار ہونا ہے۔ ﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ﴾ ''اور اگر یہ روگردانی کریں تو (اے نبی ﷺ! آپ پریشان نہ ہوں) آپؐ کے ذِمّہ صرف پہنچانے کی ذِمّہ داری ہے۔'' ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔'' کون کیا کر رہا ہے' اُس کی نگاہ سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ ہر ایک کو اُس کے کیفرِ کردار تک پہنچا کر رہے گا۔

یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرما دی گئی: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ ''اور جو کوئی بھی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔'' اور اس میں تبعاً یہ مفہوم بھی مَیں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ اگر کوئی اسلام کو بھی بحیثیتِ دین نہیں بلکہ صرف ایک عقیدے کے طور پر اختیار کرے گا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہاں پھر تفریق ہوگئی۔ دین کو اگر صرف عقائد اور عبادات تک محدود کر دیا جائے تو وہ دین نہیں' مذہب بن جائے گا۔ ﴿وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾﴾ ''اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔'' یعنی ناکام و نامراد ٹھہرے گا۔

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ﴾ ''اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو کیسے ہدایت دے گا جو اپنے ایمان کے (دعوے کے) بعد پھر کفر کی روش اختیار کر لے اور اس بات کی بھی گواہی دے کہ یہ رسول حق ہیں۔'' گویا دعویٰ تو ایمان کا کریں' لیکن اسلام کو اختیار نہ کریں۔

سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران آپس میں جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے ان میں ایک مناسبت یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں زیادہ زور (emphasis) ایمان پر

جبکہ سورۂ آل عمران میں اسلام پر ہے۔ ایمان اور اسلام اگرچہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں' لیکن اپنی جگہ پر دونوں کی علیحدہ علیحدہ حقیقت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ میں فرمایا گیا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''یہ بدّو کہہ رہے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے تم ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (مسلمان ہو گئے ہیں) جبکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔'' معلوم ہوا کہ یہ دونوں ایک وحدت بھی ہیں' یعنی ایمان دل میں اور اسلام عمل میں۔ گویا ایک باطنی کیفیت ہے اور ایک اس کا خارجی طرزِ عمل ہے' اس کا ظہور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پر ان کی علیحدہ categories بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث جبریل (جسے اُمّ السُّنَّۃ کہا جاتا ہے) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے باقاعدہ علیحدہ علیحدہ سوال کر کے اسلام اور ایمان کی تعریف (definition) معلوم کی۔ پہلے انہوں نے دریافت کیا: يَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ (۱) ''اے محمد (ﷺ)! مجھے اسلام کے بارے میں آگاہ کیجیے۔'' جب آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرما دی تو سوال کیا: فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ ''اچھا تو مجھے ایمان کے بارے میں آگاہ کیجیے'' تو آپؐ نے اس کی وضاحت بھی فرما دی۔

سورۃ البقرۃ میں ایمان پر جو زیادہ زور دیا گیا ہے اس حوالے سے میں تین مقامات کی طرف صرف اشارہ کر رہا ہوں۔ سورۃ کی ابتدا میں فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾﴾ سورۃ البقرۃ کے وسط میں آیۂ بر ہے: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾ (آیت ۱۷۷) اور اختتام پر یہ آیت ہے: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام والاحسان۔

﴿اِلَیۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟﴾ (آیت ۲۸۵) ان تینوں مقامات کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ زیادہ زور ایمان پر ہے‘ جبکہ سورۂ آلِ عمران میں زیادہ زور اسلام پر ہے‘ جیسا کہ ہم نے ابھی مطالعہ کیا۔

ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں وہ لوگ جو ایمان کے مدعی ہوں اور پھر اسلام کو اختیار نہ کریں‘ یہ درحقیقت وہ category ہے جس میں آج کا مسلمان شامل ہے کہ دعویٰ تو ایمان کا ہے لیکن اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ یہ ہے ہمارا تضاد! گویا زیرمطالعہ آیتِ مبارکہ‘ بڑی تہدید والی آیت ہے اور یہ سب سے زیادہ آج کے مسلمان پر منطبق ہوتی ہے۔ فرمایا: ﴿كَیۡفَ یَهۡدِی اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِهِمۡ وَشَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الۡبَیِّنٰتُ ؕ﴾ ”اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جو اپنے ایمان کے بعد کفر کی روش اختیار کریں؟ اور انہوں نے اس بات کی بھی گواہی دی کہ رسولؐ حق ہیں اور وہ روشن نشانیاں لے کر آئے ہیں۔“ ﴿وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۸۶﴾﴾ ”اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

اگر یہ لوگ بھی اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے اختیار کرنے کو تیار نہ ہوں تو پھر سب سے بڑے ظالم تو یہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑے مجرم تو یہ ٹھہرے۔ جو ایمان کا دعویٰ نہیں کرتے اُن کا معاملہ تو علیحدہ ہوگیا‘ لیکن اگر دعویٰ ایمان کا ہو اور اسلام کو ایک دین کی بجائے علامت کے طور پر اختیار کریں‘ اور محض اسی پر فخر ہو کہ ہم اُمّتِ محمد ﷺ ہیں‘ بلکہ عشقِ رسولؐ کا بھی دعویٰ ہو‘ تو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمۡ اَنَّ عَلَیۡهِمۡ لَعۡنَةَ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۸۷﴾﴾ ”یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی۔“

اگر دعویٰ ایمان کا ہے لیکن نظام وہی اپنایا ہوا ہے جو نہ ماننے والوں کا ہے تو یہ منافقت ہوگئی! قول و عمل کے تضاد پر اللہ تعالیٰ کا غضب کفر کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھڑکتا ہے۔ یہ مضمون قرآن حکیم میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ النساء میں الفاظ آئے ہیں:

﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ (آیت ۱۴۵) ”بے شک منافق جہنّم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔“ یہاں فرمایا: ﴿خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۸۸﴾﴾ ”ہمیشہ رہیں گے اس میں‘ ان پر سے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت ملے گی۔“ عذاب کے ضمن میں نرمی کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ عذاب کی شدّت میں کچھ تخفیف ہوجائے‘ اور دُوسری یہ کہ کچھ دیر کے لیے اس کا سلسلہ روک دیا جائے اور پھر کچھ وقفے کے بعد عذاب دوبارہ شروع ہوجائے۔ یہاں پر ان دونوں صورتوں کی نفی کردی گئی۔

البتہ اس سلسلے کی آخری آیت ہمارے لیے اُمید کی ایک کرن ہے۔ فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۸۹﴾﴾ ”سوائے اُن کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کرلیں تو اللہ بڑا غفور بڑا رحیم ہے۔“ یہ توبہ اور اصلاح انفرادی سطح پر بھی ہوگی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ انفرادی سطح پر توبہ کے ضمن میں کم ازکم یہ مطلوب ہے کہ امکانی حد تک اپنی ذاتی اصلاح کی جائے اور اپنی معاش‘ معاشرت اور گھریلو زندگی کے معاملات کو منکرات سے پاک کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کی حکومت اور خلافت کو اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار میں قائم کرنا ہوگا۔ یوں اس انفرادی سطح پر توبہ سے انسان کم ازکم اُخروی عذاب سے تو بچ سکے گا۔ اس ضمن میں یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انفرادی توبہ تو میرے اور آپ کے دائرۂ اختیار میں ہے‘ لہٰذا اس میں کوئی عذر یا تاخیر اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول نہیں۔

جہاں تک اجتماعی سطح پر توبہ کا تعلق ہے‘ اس کا تقاضا یہ ہے کہ قوم میں ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ جمع ہوجائیں جو انفرادی سطح پر توبہ کرچکے ہوں اور پھر وہ ایک قوت بن کر باطل نظام سے ٹکرا جائیں۔ اس کے نتیجے میں انقلاب آجائے گا‘ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اب اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے اپنی اجتماعی زندگی پر نافذ کردیا ہے۔ یہ اجتماعی سطح پر توبہ ہوجائے گی۔

اجتماعی توبہ میرے اور آپ کے بس میں نہیں ہے۔ جب قوم کی ایک بڑی تعداد

اسلام کو بحیثیتِ دین قبول کرے گی تب ہی ایسا ممکن ہوگا۔ اس اجتماعی توبہ کے لیے جِدّ و جُہد کو نظامِ خلافت کے قیام کے لیے کوشش کہہ لیں یا نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے اسلامی انقلاب کا نام دے لیں‘ اصلاً یہ مختلف عنوانات سے اجتماعی توبہ کی سعی اور جِدّ و جُہد ہے۔ اس کا طریق کار یہی ہے کہ لوگ انفرادی سطح پر توبہ کرنے کے بعد جمع ہو کر ایک طاقت بنیں اور پھر باطل کے نظام کو تلپٹ کر کے اسلام کو بحیثیتِ دین قائم کر دیں۔ اسی کا نام اقامتِ دین ہے‘ جس کا حکم بایں الفاظ دیا گیا: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۳) ’’کہ دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ!‘‘ اگر یہ کر لیں گے تو گویا ہماری اجتماعی توبہ ہو گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا وعدہ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۸۹﴾ اللہ تعالیٰ اِن آیات کی برکت سے ہمیں فوری طور پر انفرادی توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور اجتماعی توبہ کے لیے اپنا تن‘ من‘ دھن وقف کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین!

انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی گوشے

اب تک کی گفتگو کے حوالے سے پہلی بات تو یہ سامنے آ گئی کہ اسلام اصلاً دین ہے‘ صرف مذہب نہیں۔ دُنیا میں آج جو تصوّر کارفرما ہے‘ بین الاقوامی سطح پر جس تہذیب کا غلبہ ہے اور جو حقائق اب درجہ بدرجہ منکشف ہو رہے ہیں‘ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی گہری سازش اور پلاننگ کے تحت ایک مخصوص فکر کو پھیلایا گیا ہے۔ اس فکر کو ’’نیو ورلڈ آرڈر‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔ ’’Novo Ordus Seclorum‘‘ کے الفاظ امریکہ کے ایک ڈالر کی مالیت کے نوٹ پر بھی کندہ ہیں۔ ’’نیو ورلڈ آرڈر‘‘ کا خاکہ درحقیقت ۱۷۷۱ء میں تیار کیا گیا تھا‘ جس کے مطابق دنیا کے اندر سوچ کے رُخ کو ایک خاص انداز میں ڈھالا گیا اور اس میں یہ بات شامل کی گئی کہ مذہب سے اجتماعی زندگی کا تعلق منقطع کر کے تمام مذاہب کو صرف انفرادی زندگی تک محدود کر دیا جائے۔

عام طور پر انسانی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے‘ پھر ہر حصّہ تین ذیلی حصّوں پر مشتمل ہے۔ انسانی زندگی کے جو یہ چھ گوشے (۳+۳) مانے جاتے ہیں ان میں سے تین کا

تعلق انفرادی اور بقیہ تین کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ جو گوشے انسان کی انفرادی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں وہ ’’عقیدہ‘ عبادات اور کچھ معاشرتی رسومات‘‘ پر مشتمل ہیں۔ عقیدہ کے ضمن میں کوئی ایک خدا کو مانے‘ ہزار کو مانے یا کسی کو نہ مانے‘ سیکولرازم کی رُو سے ہر فرد یہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہوگا۔ اسی طرح مراسمِ عبودیت کی ادائیگی کس طریقے سے ہوگی‘ آیا مسجد میں جانا ہے‘ مندر میں‘ چرچ میں یا کہیں بھی نہیں‘ یہ بھی ہر فرد کا انفرادی معاملہ ہوگا۔ انفرادی زندگی کا تیسرا گوشہ معاشرتی رسومات (social customs) سے بحث کرتا ہے۔ یعنی بچے کی پیدائش پر کیا رسومات ادا کرنی ہیں؟ شادی کن رسوم و رواج کے مطابق ہوگی؟ نکاح ہوگا‘ یا پھیرے ڈلوائے جائیں گے‘ یا گرجے میں جانا ہوگا؟ وغیرہ۔ اسی طرح کسی فرد کی موت کی صورت میں میّت کی تدفین ہوگی یا اسے جلایا جائے گا یا گِدھوں اور چیلوں کو کھلا دیا جائے گا۔ سیکولرازم میں یہ تمام معاملات افراد کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے۔

اسی طرح اجتماعی زندگی کے بھی تین ہی گوشے ہیں جو معاشرتی‘ معاشی اور سیاسی نظام سے بحث کرتے ہیں۔ سیکولرازم یا نیو ورلڈ آرڈر کی رُو سے اجتماعی زندگی کے اِن تینوں گوشوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ افراد اپنی کثرتِ رائے سے‘ اپنے نمائندوں کے ذریعے قانون سازی کر کے طے کریں گے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ مثال کے طور پر کسی معاشرے میں شراب محض اس لیے حرام قرار نہیں دی جا سکے گی کہ اسلام میں حرام ہے۔ اسی طرح کسی اور مذہب میں کوئی اور چیز حرام ہے تو اُس پر بھی مذہب کی بنیاد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکے گی‘ البتہ کثرتِ رائے سے اگر فیصلہ ہو جائے تو اسے حرام قرار دیا جا سکے گا۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ دو مرد اگر اپنی جنسی خواہش ایک دوسرے سے پوری کرنا چاہیں اور میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہیں تو کثرتِ رائے سے ایسا قانون بھی بن سکتا ہے۔ گویا اجتماعی زندگی میں قانون سازی عوام کی کثرتِ رائے سے اُس کے نمائندوں کے ذریعے عمل میں آئے گی‘ اور یہی دراصل سیکولرازم ہے۔

یہاں درمیان میں ایک اہم چیز اور آتی ہے جو اِس وقت دنیا میں مابہ النزاع بنی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف تو وہ انفرادی ہے اور دوسری طرف اس کا تعلق اجتماعیت سے بھی

جڑتا ہے‘ اور وہ ہے عائلی قوانین (family laws)۔ یہ اس اعتبار سے انفرادی زندگی کا حصّہ بنتے ہیں کہ ازدواجی بندھن میں بندھنے کے لیے آیا نکاح کرنا ہے‘ پھیرے ڈلوانے ہیں یا چرچ میں شادی کی رسومات ادا کرنی ہیں‘ یہ فرد کا انفرادی معاملہ ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ اجتماعیت کا نقطۂ آغاز بھی تو ہے۔ معاشرت اور اجتماعیت کی پہلی اینٹ تو یہی ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں اگر کسی مذہب کا عمل دخل قبول کر لیا جائے تو سیکولرازم کی رو سے یہ مذہب کی طرف سے اجتماعیت کے اندر نقب لگانے کے مترادف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اِس وقت دنیا میں اس بات کا بڑا چرچا ہے کہ عائلی قوانین کے ضمن میں ایک کامن سول کوڈ (Common Civil Code) ہونا چاہیے‘ اور یوں یہ معاملہ بھی مذاہب کے زیر اثر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اگر آپ امریکہ میں رہ رہے ہیں تو شادی بیاہ کے ضمن میں وہاں آپ پر امریکی قوانین کی پابندی لازمی ہے‘ خواہ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ یہی کشمکش اب بھارت میں بھی جاری ہے۔ ہندوؤں کی ہر ممکن کوشش ہے کہ کسی طور بھارتی مسلمانوں کے عائلی قوانین ختم کر کے ایک کامن سول کوڈ کا اطلاق کیا جائے‘ جو اُن کے نزدیک قومی یکجہتی کے لیے ناگزیر ہے۔ گویا یہ کوشش پورے شدّ و مدّ سے جاری ہے کہ اس سے پیشتر کہ مذہب اجتماعی زندگی میں کچھ نقب لگائے‘ کیوں نہ سیکولرازم کو مذہبی زندگی اور گھر کے دائرے کے اندر نقب لگانے کا موقع فراہم کیا جائے اور گھر کی چار دیواری میں بھی مذہب کا عمل دخل ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا اِس وقت ایک بڑی گہری سازش کے تحت اس بات کی پوری کوشش ہو رہی ہے کہ مذہب کو انفرادی زندگی سے بھی بے دخل کر دیا جائے۔ یہ بات انسانی ذہنوں کے اندر اس طرح اُتار دی گئی ہے کہ پوری دنیا اسی اصول پر کارفرما ہے۔ مسلمان بھی بظاہر اسلام کا نعرہ تو لگاتے ہیں لیکن درحقیقت اسلام کو مذہب مانتے ہیں‘ دین نہیں۔ دنیا کے کسی بھی مسلم ملک میں زندگی کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں جہاں اسلام کو دین کی حیثیت سے رائج کیا گیا ہو۔ بس کچھ مراسمِ عبودیت کی پابندی ہے۔ مسجدیں اچھی سے اچھی بن رہی ہیں۔ رمضان کے دوران روزے کے احکامات کے ضمن میں کچھ سختی سے عمل نظر آ جائے گا۔ گویا اسلام کو ہم نے صرف

کچھ مراسمِ عبودیت اور سماجی رسومات تک محدود کر دیا ہے‘ جبکہ اجتماعی زندگی کا نقشہ ہمارا بھی وہی ہے جو غیر مسلموں کا ہے۔ یہی دراصل سیکولرازم ہے جو اِس وقت پوری دنیا کا دین ہے۔ اگرچہ کچھ احیائی تحریکوں کے ذریعے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے پیش کیا جائے‘ لیکن فی الواقع دنیا میں کہیں بھی اسلام بحیثیتِ دین موجود نہیں ہے‘ بلکہ صرف ایک مذہب بن کر رہ گیا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام مذہب نہیں ہے۔ اسلام میں مذہب بھی ہے۔ اس کے مسلّمہ عقائد ہیں‘ جیسے توحید‘ ایمان بالرسالت‘ فرشتوں پر ایمان‘ آخرت کا عقیدہ۔ اس میں عبادات کا نظام ہے۔ نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ وغیرہ ہیں۔ پھر اس کے معاشرتی قوانین ہیں۔ سماجی بُرائیوں (social evils) کا تصوّر ہے جنہیں ختم کرنا ہے۔ سماجی اقدار (social values) کا تصوّر ہے جنہیں عام کرنا ہے۔ اس میں شادی بیاہ ہے‘ عقیقہ ہے‘ نمازِ جنازہ ہے‘ تجہیز و تکفین ہے۔ اس کے اپنے بھرپور اور مکمل عائلی قوانین ہیں‘ جنہیں مسلمانانِ پاکستان نے قومی سطح پر بحیثیتِ مجموعی مسترد کر رکھا ہے جبکہ بھارتی مسلمان ان کے دفاع میں آج تک ڈٹا ہوا ہے۔ وہ کب تک ڈٹا رہے گا‘ مَیں یہ نہیں کہہ سکتا‘ اس لیے کہ وہاں پر حالات بڑی تیزی سے ایک دوسرے رُخ پر جا رہے ہیں۔ بہرحال ہمارے مقابلے میں اُن کا پلڑا اس اعتبار سے بھاری ہے کہ انہوں نے جدید تہذیب کو اپنے عائلی قوانین میں نقب لگانے کی اجازت نہیں دی‘ جبکہ ہمارے ہاں جدید مغربی فکر عائلی قوانین کے اندر بھی نقب لگا چکا ہے۔

۱۹۶۲ء میں ایک آرڈی نینس کے ذریعے یہاں غیر اسلامی عائلی قوانین نافذ کر دیے گئے‘ پھر انہیں قانونی حیثیت دے دی گئی۔ تمام مکاتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے انہیں غیر اسلامی قرار دیا۔ ان میں سے چند نام ملاحظہ کیجیے: امیر جماعت اسلامی سیّد ابوالاعلیٰ مودودی‘ اہلِ تشیع میں سے مفتی جعفر حسین مجتہد اور حافظ کفایت حسین‘ بریلوی علماء میں سے مولانا ابوالحسنات قادری اور مولانا محمود احمد رضوی‘ دیوبندی علماء میں سے مفتی محمد شفیع صاحب‘ اہلِ حدیث حضرات میں سے حافظ عبداللہ روپڑی۔ تمام مکاتبِ فکر کے علماء نے کہا کہ یہ

قوانین غیر اسلامی ہیں لیکن ایک فوجی آمر نے انہیں نافذ کیا اور وہ آج تک نافذ ہیں‘ ان میں سرِمُو فرق نہیں آیا۔ اس دوران گیارہ برس پر محیط ’’اسلامی مارشل لاء‘‘ بھی گزر گیا اور اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت بھی‘ لیکن پرنالہ وہیں کا وہیں ہے۔

یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام دین ہے اور مذہب اس کا ایک جزو ہے۔ جب تک ہم اسے دین کی حیثیت سے تسلیم اور نافذ نہیں کریں گے‘ ہماری کوئی حقیقت ہی نہیں۔ ہمارا مُنہ نہیں کہ ہم اللہ سے مخاطب ہوں‘ اُس سے دعا کریں‘ مخاطبہ اور مکالمہ کریں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ (المائدۃ:۶۸)

’’(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! ان سے) کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب! تم کسی شے پر نہیں ہو (تمہارا کوئی مقام نہیں ہے) جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہیں کرتے اور اُس کو جو نازل کیا گیا تمہاری طرف تمہارے ربّ کی طرف سے۔‘‘

قرآن حکیم میں یہ خطاب اہلِ کتاب سے ہے‘ لیکن ہمارا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے۔

دوقومی نظریہ اور علّامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد

بیسویں صدی کے دوران ایک بہت بڑی انقلابی تبدیلی کی کوشش ہوئی‘ جس کی بنیاد ’’دوقومی نظریہ‘‘ تھا۔ یہ وہ دَور تھا جب ہر طرف سیکولرازم کا چرچا تھا۔ پوری دنیا کی فضا متحدہ وطنی قومیت (Territorial Nationalism) کے نعرے سے گونج رہی تھی کہ ایک ملک کے رہنے والے ایک قوم ہیں اور مذہب ان کا انفرادی معاملہ ہے۔ اُس وقت برعظیم میں ایک آواز اٹھی جو نہایت زوردار تھی۔ اگرچہ اس کے مختلف سیاسی اور تاریخی اسباب بھی تھے‘ لیکن جس چیز نے اسے ایک تحریک کی شکل دی وہ علّامہ اقبال کا ۱۹۳۰ء کا خطبۂ الٰہ آباد تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام ایک دین ہے‘ جس پر دورِ ملوکیت میں بہت سے پردے پڑ گئے‘ اور یوں اسلام کا اصل نظام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم کشاکش کا حل بھی یہی ہے کہ اس خطے کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا

جائے۔ ایک مسلمان اور دوسرا ہندو اکثریت کا علاقہ۔ اس سے جہاں ان دونوں قوموں میں منافرت اور کشاکش ختم ہو گی وہیں انہیں موقع مل جائے گا کہ اپنی اپنی پسند کا نظام لے آئیں۔ اس کے برعکس اگر ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو جاتا ہے تو مسلمان ایک غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ اس صورت میں وہ اپنے نظام کو بروئے کار لانے کی پوزیشن میں نہیں رہیں گے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کے لیے ایک ایسا خطہ چاہتے ہیں جو اُن کی اکثریت پر مشتمل ہو۔ اس طرح انہیں یہ موقع میسّر آ جائے گا کہ عرب شہنشاہیت کے دَور میں اسلام کے چہرے پر جو پردے پڑ گئے تھے ان کو ہٹا کر اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے‘ تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلام نوعِ انسانی کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں یہ بات زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ نظریۂ پاکستان کے ضمن میں علّامہ اقبال کے مذکورہ خطبہ کو لوگوں کے سامنے اجاگر کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

یہ وہ دَور تھا جب خود قائداعظم بھی اپنے چودہ نکات سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ ابھی تک وہ اس کوشش میں تھے کہ ہندو مسلم مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا یہ علّامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد ہی تھا جس نے تحریک پاکستان کو ایک نیا رُخ‘ نئی سوچ‘ نئی امنگ اور نیا تصوّر دیا۔ اگرچہ مذکورہ خطبے میں لفظ پاکستان نہیں تھا‘ لیکن علّامہ اقبال کے الفاظ "At least in the north west of India" اسی خطۂ ارضی کی نشان دہی کر رہے تھے جسے آج دُنیا ’’پاکستان‘‘ کے نام سے جانتی ہے۔ علّامہ اقبال کے نزدیک ’’دین‘‘ کا ایک وسیع تصوّر تھا اور وہ سیاست کو بھی دین کا حصّہ سمجھتے تھے ع ’’جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی‘‘۔ وہ چاہتے تھے کہ اس خطۂ ارضی میں اسلام مذہب کی حیثیت سے نہیں‘ بلکہ دین کی حیثیت سے نافذ ہو۔ یہ ایک نعرۂ مستانہ تھا‘ جس کے فروغ کے لیے انہوں نے اپنی شاعری کو بھی ذریعہ بنایا: ؎

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!

فکری اعتبار سے علّامہ اقبال کا مذکورہ خطبہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک بہت بڑا انقلابی نعرہ تھا جو سیکولرازم کی نفی پر مبنی تھا‘ جس کا اُس وقت بھی پوری دنیا پر غلبہ تھا اور آج بھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دورِ خلافت راشدہ کا نمونہ سامنے لانا آج دُنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہے‘ کیونکہ نوعِ انسانی کا قافلہ کسی آئیڈیل نظام کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ انسان مختلف تجربات کرتا ہے‘ لیکن ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نوعِ انسانی کی کتنی مساعی صرف ہوئیں‘ کتنے انسانوں نے خون دیا‘ کتنی جِدّوجُہد ہوئی‘ جب کہیں کمیونسٹ انقلاب آیا تھا‘ لیکن آج وہ تاش کے پتّوں کی طرح بکھر کر‘ بلکہ موم کے بنے ہوئے گھر (house of wax) کی طرح پگھل کر رہ گیا اور وہ ساری محنت اور جِدّوجُہد اکارت گئی۔ یہ کتنے بڑے پیمانے پر نوعِ انسانی کا اجتماعی ضیاع اور نقصان ہے! ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ اصل ہدایت پر تو پردے پڑے ہوئے ہیں اور جو اِس ہدایت کے عَلَم بَردار ہیں وہ خود اوروں کے پرستار بنے ہوئے ہیں۔ اپنے نظام کے اوپر وہ پردے ڈال کر بیٹھے ہیں‘ بلکہ یوں کہیے خزانے کا سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں جو نہ تو خود اس سے کوئی استفادہ کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو قریب آنے دیتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک بہت بڑا انقلابی مشن تھا جس کو نظریۂ پاکستان کہا جاتا ہے‘ اور اس کے ضمن میں علّامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد پر ازسرِنو توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔

تقسیمِ ہند کا حاصل؟

اس سارے منظرنامے میں‘ جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے تقریباً نصف صدی کا عرصہ گزر چکا‘ ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ حاصل کیا ہوا! مَیں یہ نہیں کہہ رہا کہ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہر چیز کی نفی کر دینا بھی انتہا پسندی ہے۔ جو چیز حاصل ہوئی ہے اس کو سمجھ لیجیے۔ اگر پورا ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو جاتا تو اس صورت میں اسلام کے اجتماعی نظام کے بروئے کار آنے کا امکان تقریباً صفر کے درجے میں ہوتا۔ میں ’’تقریباً‘‘ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی کلیۃً نفی بہرحال نہیں کی جاسکتی‘ اس لیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ

کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ آپؐ نے فردِ واحد سے دعوت کا آغاز کر کے انقلاب برپا کر دیا۔ لیکن برعظیم کے زمینی حقائق کے پیشِ نظر اِس بات کا امکان تقریباً صفر تھا کہ یہاں اسلام ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے آسکے۔

جِدّوجُہدِ آزادی کے نتیجے میں ابتداءً دو ملک وجود میں آ گئے۔ ایک ملک میں غالب اکثریت مسلمانوں کی اور دوسرے میں ہندوؤں کی تھی۔ یوں دونوں کو یہ موقع میسّر آ گیا کہ اپنی اکثریت کی بنیاد پر اپنی اپنی پسند کا نظام لے آئیں۔ ؎

برآور ہر چہ اندر سینہ داری سرودے‘ نالۂ‘ آہے‘ فغانے!

مسلمانوں کو یہ سنہری موقع مل گیا کہ اپنی غالب اکثریت کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا نمونہ دنیا کو دکھا دیں۔ اس کا ایک امکان پیدا ہوا‘ لیکن بعد میں جو صورت حال بنی اس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوا اور بنگلہ دیش ایک الگ ملک کی حیثیت سے وجود میں آ گیا۔ اس طرح دو کی بجائے تین ملک ہو گئے اور تقسیم کے وقت پاکستان اور بھارت کا جو نسبت تناسب تھا وہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ بنگلہ دیش ایک ایسا ملک ہے جس میں مسلمان اکثریت میں تو ہیں لیکن ایسی فیصلہ کن اور غالب اکثریت میں نہیں کہ اُن سے اس اصول کی بنیاد پر کوئی زیادہ توقع کی جاسکے۔ البتہ مغربی پاکستان وہ ملک ہے جہاں کم از کم نام کے مسلمان اور ایمان کے مدّعی اتنی غالب اور فیصلہ کن اکثریت میں ہیں کہ اگر یہ بالفعل چاہیں تو دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو نظامِ اسلام کے قیام کے معاملے میں ان کے راستے کی رکاوٹ بن سکے۔ گویا پورے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی ذِمّہ داری کا بوجھ اب ہمارے کندھوں پر آ گیا ہے۔ لہٰذا اگر اتنی غالب اور فیصلہ کن اکثریت کے باوجود بھی ہم یہاں اسلام کا نظام قائم نہیں کرتے تو پھر ہم سے بڑا بدنصیب‘ اللہ کا باغی اور مجرم کون ہوگا!

قائداعظم اور سیکولرازم

آگے بڑھنے سے قبل میں قائداعظم کے ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کے متنازعہ جملے کے

بارے میں ذرا وضاحت کرنا چاہتا ہوں‘ جس کے بارے میں مَیں یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ کاش وہ یہ الفاظ نہ کہتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے نزدیک اُن کے اس جملے کی ایک توجیہہ بھی ہے‘ کیونکہ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ قائداعظم ایک راست باز انسان تھے۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اُن کے بدترین ناقدین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ ایک راست رَو (straight forward) اور دیانت دار آدمی تھے‘ اُن کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے کم از کم یہ کام تو کر دکھایا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا‘ ورنہ ہندوستان اگر ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوتا تو اس میں نظامِ اسلام کے دین کی حیثیت سے قیام کا تقریباً کوئی امکان نہیں تھا۔ لہٰذا یہ ایک بہت بڑی کامیابی (achievement) ہے جو مسلم لیگ کے ذریعے حاصل ہوئی۔ متذکرہ بالا جملے سے قائداعظم کا منشا یہی تھا کہ یہاں ہمیں اسلام لانے کے لیے سیاسی اور جمہوری راستہ اختیار کرنا چاہیے‘ بجائے اس کے کہ ہم جذباتی نعرہ بازی کے ذریعے پوری دنیا کو چوکنا کر دیں۔ اس طرح یہ امکان پیدا ہو سکتا تھا کہ بنیاد پرستی (fundamentalism) جو آج ایک گالی بنا دی گئی ہے‘ شاید اُسی وقت بنا دی جاتی اور دنیا کی ساری سیکولر قوتیں اُسی وقت "Nip the evil in the bud" کے مصداق پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرح سے قائداعظم نے breathing space حاصل کی کہ جب ہم ایک مقصد جمہوری اصول کے تحت حاصل کر سکتے ہیں اور سیکولرازم بھی ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنتا تو مذہب کی بجائے اکثریت کی بنیاد پر اسلام کا نظام لایا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنی کتاب ’’استحکامِ پاکستان‘‘ میں قائداعظم کے محولہ بالا جملہ کی توجیہہ اِن الفاظ میں پیش کی ہے:

> ’’راقم کے نزدیک قائداعظم کا وہ قول نہ تو اُن کے سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر تھا‘ اس لیے کہ قائداعظم مرحوم خواہ ایک ’’مذہبی شخصیت‘‘ نہ تھے تاہم ہرگز دنیا کے عام سیاست دانوں کے مانند جھوٹے اور فریبی نہیں تھے اور اُن کے کردار کی مضبوطی‘

سیرت کی پختگی‘ ظاہر و باطن کی یکسانیت اور صداقت و امانت کا لوہا اُن کے بدترین دشمن بھی مانتے ہیں۔ اسی طرح اُن کا وہ متنازع جملہ حالات کے وقتی دباؤ کے تحت اعصاب کے متأثر ہو جانے کا بھی مظہر نہیں تھا‘ اس لیے کہ قائداعظم کے اعصاب ہرگز اتنے کمزور نہ تھے‘ بلکہ وہ واقعتاً فولادی اعصاب کے مالک تھے اور بُرے سے بُرے حالات میں بھی اُن پر کبھی گھبراہٹ یا سراسیمگی کے طاری ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ راقم کے نزدیک اُن کے اس قول کی اصل توجیہہ اور اُن کے سابق موقف کے ساتھ اس کی مطابقت و موافقت کی صورت یہ ہے کہ پیشِ نظر اوّلاً برعظیم پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کے دین و مذہب‘ تہذیب و ثقافت اور سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت و مدافعت تھی جو قیامِ پاکستان کی صورت میں بتمام و کمال حاصل ہو گئی‘ اور ان چیزوں کے ضمن میں ہندوؤں کے نامنصفانہ بلکہ منتقمانہ رویے سے پیدا شدہ خطرات کا سدِباب ہو گیا۔ ثانیاً پاکستان میں واقعتاً اسلامی نظام کے بالفعل قیام کے ضمن میں اُن کے پیش نظر ایک خالص جمہوری طریقہ تھا۔ یعنی یہ کہ اگر پاکستان کے مسلمانوں میں جو ایک غالب اور فیصلہ کن اکثریت میں ہیں‘ واقعتاً اسلام کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ پیدا ہو جائے اور وہ حقیقتاً اور واقعتاً اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ اور اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ و اجراء کے خواہاں بن جائیں تو خالص سیکولر جمہوری نظام بھی اُن کے راستے میں ہرگز رکاوٹ نہیں بن سکتا اور اُن کے ’’اجتماعی ارادے‘‘ (collective will) کے بروئے کار آنے میں ہرگز کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا فوری طور پر دستوری اور قانونی سطح پر مذہبیت کا راگ الاپنے اور پوری دنیا کو خبردار اور چوکنا کر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک جمہوری نظام میں قانون سازی کا سارا دارومدار کثرتِ رائے پر ہوتا ہے‘ لہٰذا اگر بالفرض پاکستان میں ایک سیکولر لیکن حقیقتاً جمہوری نظام قائم ہو جائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو دین و مذہب کی جانب پیش قدمی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی!

اب یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو قائداعظم کی اس رائے سے اختلاف ہو اور وہ اس طریق کار کو اسلامی نظام کے قیام اور قانونِ اسلامی کے نفاذ و ترویج کے لیے درست اور مؤثر نہ سمجھے‘ لیکن اس توجیہہ سے وہ سارے اشکال حل ہو جاتے ہیں جو اس جملے

کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں‘ اور نہ کسی انحراف کا کوئی سوال باقی رہتا ہے نہ کسی وقتی اور فوری سراسیمگی کا۔ هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ!‘‘

ہماری مذہبی جماعتوں کا طرزِ عمل

البتہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بالفعل ہوا کیا ہے۔ بدقسمتی سے اسی تصوّر کو ہماری مذہبی جماعتوں نے بھی عملاً اختیار کر لیا۔ یہ حضرات قائداعظم کے اس موقف کے حوالے سے انہیں ہدفِ تنقید بناتے ہیں‘ لیکن عملاً وہی کچھ کر رہے ہیں‘ یعنی وہی جمہوری اور انتخابی سیاست۔ مجھے اس طریق کار سے اختلاف کیوں ہے؟ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر مسئلہ صرف مذہب کا ہوتا تو اسلام بطورِ مذہب تو بھارت میں بھی تا حال موجود ہے۔ ایک دو مسجدوں میں جھگڑا ہو جانا یا جن علاقوں میں مسلمان بالکل ختم ہو گئے وہاں کی مساجد کا اصطبل بنا دیا جانا ایک دوسری بات ہے‘ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ بھارت میں مساجد پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ آباد ہیں۔ اسی طرح اسلام بطورِ مذہب تو امریکہ میں بھی ہے۔ اصل مسئلہ ہے اسلام بطور دین اور نظام کا‘ اور یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ نظام انتخابات کے ذریعے کبھی تبدیل نہیں ہو سکتا۔ نظام تو ہمارے ہاں جاگیرداری کا ہے۔ اسلام کے حوالے سے بھی اس نظام میں ایسی چیزیں شامل کر دی گئی ہیں جو دورِ ملوکیت کی طرح آج بھی قائم و دائم ہیں۔ وہی مسلمان جاگیردار اور سرمایہ دار آج بھی موجود ہیں جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا: ؎

جانتا ہوں مَیں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں
جانتا ہوں مَیں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

چنانچہ جب یہ طرزِ عمل ہماری مذہبی جماعتوں نے بھی اختیار کر لیا تو سارا فساد یہیں پیدا ہوا۔ اس کا صُغریٰ کُبریٰ یہ ہے کہ اصل معاملہ نظام کا ہے‘ لیکن نظام انتخابات کے ذریعے بدل نہیں سکتا۔ ووٹ تو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی گرفت میں ہیں‘ ان کے خلاف ووٹ کون اور کیسے دے گا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے‘ اور یہی ہوتا بھی رہا ہے‘ کہ ایک جاگیردار کے

مقابلے میں کسی دوسرے کو لے آئیں۔ ایک قریشی کے بجائے دوسرا قریشی‘ ایک گیلانی کے بجائے دوسرا گیلانی اور ایک مزاری کے بجائے دوسرا مزاری آ جائے۔ اسی طرح قیاس کرتے چلے جایئے۔ چونکہ موجودہ نظام کے تحت پھندے میں پھنسا ہوا ووٹ اُس کے خلاف نہیں جا سکتا‘ لہٰذا نظام الیکشن کے ذریعے تبدیل کرنا ناممکن ہے۔

اس سارے منظر نامے میں جب ہماری مذہبی جماعتوں نے الیکشن میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا تو نظام کی بات انہیں خود چھوڑنی پڑی۔ مَیں کسی ایک جماعت کا نام نہیں لے رہا۔ اس راستے میں یقیناً کچھ لوگوں نے اوّلین پیش قدمی کی ہے اور کچھ اُن کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔ کچھ آگے بڑھے ہیں‘ کچھ اُن کے پیچھے آئے ہیں۔ مَیں اِس وقت کسی کو علیحدہ نہیں کر رہا‘ بلکہ جن مذہبی جماعتوں نے یہ سمجھا کہ الیکشن کے ذریعے وہ یہاں اسلام لا سکتے ہیں اُن کے مجموعی طرزِ عمل کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ اس طرزِ عمل کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس دَور میں جاگیرداروں کو راضی کرنے کے لیے ایسی کتابیں لکھی گئیں جن کے ذریعے انہیں اطمینان دلانے کی سعی کی گئی کہ اسلام میں جاگیرداری بھی ہے اور زمینداری بھی۔ ہماری مذہبی جماعتیں یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ سارا معاملہ تو اِن (جاگیرداروں اور زمینداروں) کے ہاتھ میں ہے‘ لہٰذا اگر یہ طبقات نہ چاہیں تو ہمارے لیے اقتدار کا راستہ کیسے ہموار ہو گا! یوں ہماری مذہبی جماعتوں نے اپنے آپ کو دورِ ملوکیت والے اسلام کے علمبردار کے طور پر پیش کیا جس نے جاگیرداری اور زمینداری کو برقرار رکھا ہے۔ پیش نظر تو یہ تھا کہ الیکشن کے ذریعے اگر اقتدار مل جائے تو اسلامی نظام لے آئیں گے‘ لیکن اس بنیادی غلطی کے سبب سارا صغریٰ کبریٰ غلط ہو گیا۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ الیکشن کے ذریعے نظام نہیں بدلا جا سکتا تو طے یہ ہوا کہ نظام پر تو انگلی مت اٹھاؤ‘ بلکہ جاگیردار اور زمیندار طبقے کو یہ اطمینان دلاؤ کہ ہمارے بارے میں کوئی اندیشے نہ رکھو۔ یوں ہوتے ہوتے بات صرف قانونِ شریعت تک محدود ہو کر رہ گئی۔ رہا نظام جس کے لیے یہ ساری تگ و دَو تھی‘ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب بات صرف قانونِ شریعت تک محدود ہو کر رہ گئی‘ تو کچھ لوگوں کو یہ موقع مل گیا

کہ قانونِ شریعت کے نام پر کچھ ادھورے قسم کے اقدامات کیے گئے یا محض کچھ لیبل تبدیل کر دیے گئے۔ جیسے یہاں زکوٰۃ کا نفاذ عمل میں آیا‘ سود کا نام تبدیل کر کے مارک اپ رکھ دیا گیا‘ سیونگ اکاؤنٹ کو پی ایل ایس کا نام دے دیا گیا اور حدود آرڈی نینس کا نفاذ ہوگیا‘ وغیرہ۔ یوں قانون کا چہرہ کسی درجے میں تبدیل کر دیا گیا‘ رہا نظام تو وہ صدفی صد جوں کا توں رہا۔ کسی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوجائے تو کم از کم داغ تو پڑ جاتا ہے‘ لیکن یہاں تو موجودہ نظام پر کوئی داغ تک نہیں پڑا‘ وہ جوں کا توں موجود ہے۔ یہ ہے اصل میں اس سارے طرزِ عمل کا نتیجہ جو پاکستان میں نکلا۔

بھارتی مسلمانوں کی غلط حکمتِ عملی

اِس صورت حال کا مداوا کس طرح ہوسکتا ہے اور ہمارے کرنے کا اصل کام کیا ہے؟ اس سے پہلے میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ بھارت کے مسلمانوں نے اس سے بھی بڑھ کر غلطی کی کہ انہوں نے ہندو کے غلبے کے خوف کی بنیاد پر سیکولرازم کو بطورِ ڈھال اختیار کر لیا۔ ہمارا مُنہ نہیں ہے کہ ہم انہیں کوئی مشورہ دیں۔ بہت سے مواقع پر سعودی عرب‘ امارات اور امریکہ میں مقیم بعض بھارتی مسلمانوں نے مختلف ملاقاتوں کے دوران جب کوئی مشورہ مانگا تو میرا جواب یہی تھا کہ ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کوئی مشورہ آپ کے گوش گزار کریں۔ آپ کے جو بھی حالات ہیں اور جن مسائل اور مشکلات کا آپ شکار ہیں‘ اُن کے پیش نظر ہمارے پاس تو آپ کے لیے بجز ندامت اور کچھ نہیں ہے۔ آپ کی cost پر ہم پاکستان میں عیش کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کو ہندو کے پاس یرغمال بنوایا اور خود گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہیں۔ پاکستان جس مقصد کے لیے بنایا تھا‘ وہ ہم نے پورا نہیں کیا۔ آپ نے تو پاکستان بنوا کر ہمیں اسلامی نظام کے قیام کے لیے ایک موقع فراہم کر دیا تھا‘ گویا ایک درجے میں آپ اپنا فرضِ کفایہ ادا کر چکے۔ چنانچہ ہم تو آپ کے مجرم ہیں۔ اب میرا بھارت آنا جانا کچھ زیادہ ہوا ہے اور وہاں بعض مشاہیر اکابرین سے میری جو گفتگوئیں ہوئی ہیں تو مَیں نے محسوس کیا کہ کچھ بات ان سے بھی کہی جاسکتی ہے۔ اگرچہ ابھی تک جتنی باتیں بھی مَیں نے ان کے سامنے رکھی ہیں‘ ماسوائے ایک دو استثناءات

کے‘ کسی کو اس بارے میں سوچنے پر آمادہ نہیں پایا۔ لیکن جو بات صحیح ہو وہ کہنی تو بہرحال ضرور چاہیے۔ کیا عجب آج کسی کے دل میں بیج پڑ جائے‘ جو کل ظاہر ہو جائے! اس کے امکانات بہرحال موجود ہیں۔

بھارتی مسلمانوں نے اس خوف کے سبب کہ ہندو اکثریت کی بنیاد پر بھارت میں رام راج آسکتا ہے اور اس کے نتیجے میں مسلمان ملیچھ ہو جائے گا‘ سیکولرازم کو ایک ڈھال کے طور پر اختیار کر لیا۔ سیکولرازم تو اسلام کی نفی ہے۔ آپ کسی نظام میں مجبور ہوں تو یہ الگ بات ہے‘ جیسے بنی اسرائیل آلِ فرعون کے عذاب کی چکّی میں پس رہے تھے‘ لیکن خود کسی غیر اسلامی نظام کو ذہناً قبول کر کے اُس کے عَلَم بَردار بن جانا درحقیقت بہت بڑی بنیادی فکری غلطی ہے۔ یہی غلطی بھارتی مسلمانوں سے مصلحت کے تحت ہوئی کہ اُن کے نزدیک اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے سیکولرازم کا سہارا لے کر قومی سیاست میں شمولیت اختیار کر لی اور اس طرح متحدہ قومیت کے نظریے کو بالفعل تسلیم کر لیا‘ حالانکہ پاکستان بنانے میں بھارتی مسلمانوں نے حصّہ اس اصول کی بنیاد پر لیا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں‘ ورنہ تحریک پاکستان میں اُن کا حصّہ لینا بے معنی تھا۔ ایک الگ قوم ہونے کی حیثیت سے جداگانہ قومی تشخص ایک علیحدہ شے ہے‘ جبکہ علاقائی وطنیت (Territorial Nationalism) اور سیکولرازم ایک بالکل دوسرا دین ہے۔ ان دونوں میں نہ کوئی ربط ہے اور نہ مناسبت۔

درحقیقت ہونا یہ چاہیے تھا کہ بھارت کے مسلمان اپنے اسی موقف پر قائم رہتے کہ ہم علیحدہ قوم ہیں اور عظیم تر ہندی قومیت کا جزو نہیں ہیں۔ اپنے لیے ان اقلیتی حقوق کی گارنٹی مانگتے جو دنیا میں اقلیتوں کے مسلّمہ حقوق ہیں‘ اور اگر ان کے حقوق کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو اس کے تحفّظ کے لیے ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار کرتے۔ لیکن بدقسمتی سے سیکولرازم کو ڈھال بنا کر اور متحدہ قومیت کے نظریے کو ذہناً‘ عقلاً اور عملاً قبول کر کے بھارتی مسلمانوں نے آج تک پایا تو کچھ نہیں‘ لیکن کھویا بے پناہ ہے۔ جو کچھ پایا ہے‘ وہ ایجی ٹیشن کے راستے سے ہی پایا ہے۔ ’’شاہ بانو کیس‘‘ میں بھارتی سپریم کورٹ نے مسلمانوں کے عائلی قوانین میں

دراندازی کرتے ہوئے طلاق کے قانون میں صرف ایک اضافہ کر دیا تھا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک مطلّقہ عورت کی دوسری شادی نہ ہو جائے یا اُس کا انتقال نہ ہو جائے‘ اُس کا نان نفقہ سابقہ شوہر کے ذِمّہ رہے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اگر مطلّقہ عورت کسی وجہ سے دوسری شادی نہ کرنا چاہے اور سابقہ شوہر اُس کی مالی معاونت کرنا چاہے تو اسلام اس سے روکتا نہیں‘ لیکن سابقہ شوہر یہ سب کسی پابندی کے بغیر تبرّعاً اور رضا کارانہ طور پر کرے گا۔ اس ضمن میں اسلام سابقہ شوہر پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ اسلام میں شوہر کی ذِمّہ داری صرف عدّت پوری ہونے کی حد تک ہے۔ جیسے ہی عدّت پوری ہوئی اور علیحدگی عمل میں آ گئی تو سابقہ شوہر کی ذِمّہ داری ختم ہو جائے گی۔ سپریم کورٹ کے مذکورہ بالا فیصلے کے خلاف بھارتی مسلمانوں نے مسلم پرسنل لاء بورڈ تشکیل دے کر احتجاجی تحریک چلائی‘ جلسے کیے‘ جلوس نکالے‘ جس کے نتیجے میں گولیاں بھی چلیں اور مسلمانوں نے جانیں بھی دیں‘ یہاں تک کہ اس ایجی ٹیشن کے نتیجے میں حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے‘ اور یہ قانون بن گیا کہ مسلمانوں کے پرسنل لاء میں بھارت کی کوئی عدالت دخل نہیں دے سکتی۔ تاریخی اعتبار سے یقیناً یہ ایک بہت بڑی کامیابی اور achievement تھی جو مسلمانانِ ہند کو ایجی ٹیشن کے راستے سے حاصل ہوئی۔ الیکشن کے راستے سے تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔ الیکشن کے ذریعے کتنے مسلمان بھارتی پارلیمنٹ میں آ سکتے ہیں؟ پورے بھارت میں ماسوائے دو یا تین سیٹوں کے ایک بھی یقینی مسلم سیٹ نہیں ہے۔ لہٰذا کہیں بھی مسلمان اپنے ووٹ کے بل پر الیکشن نہیں جیت سکتے۔ نتیجۃً کسی بھی سیکولر پارٹی‘ خواہ وہ کانگریس ہو یا جَنتا دَل‘ سے مفاہمت کر کے انہی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا پڑے گا اور یوں ان پارٹیوں کے پورے نظریے‘ فلسفے اور منشور سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ مسلمانوں کا اپنا جداگانہ تشخص ختم ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کے سبب بھارت میں ایک خاص کلچر فروغ پا رہا ہے۔ اونچے طبقے میں تو ہندو مسلم کلچر آپس میں گھل مل گئے ہیں اور اسلامی کلچر ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عوامی سطح پر بھی بڑی تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی ہے اور دانشور‘ صحافی‘

سیاست دان سبھی سیکولرازم کو ہی اصل حقیقت سمجھنے لگے ہیں۔ گویا اسلام ایک دین کی حیثیت سے قصۂ ماضی بنتا جا رہا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی: ؎

میرے اسلام کو اب قصّہ ماضی سمجھو!
ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!

اس طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ تو یہی نکلے گا اور ہندو اکثریت اسی پر راضی ہو جائے گی۔ اب جھگڑا اور کس بات کا ہے؟ رہا مسلمانوں کے مسجدوں میں جانے کا معاملہ تو اس پر نہ تو پہلے کوئی پابندی تھی نہ اب کوئی اعتراض ہوگا۔ مقبروں اور مزاروں کی تو ہندو خود بھی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ مَیں خود گزشتہ دورۂ بھارت کے دوران حصار میں دیکھ آیا ہوں۔ وہاں ایک بہت بڑے نقشبندی بزرگ مظفر علی خان کی قبر ہے‘ جس کا بڑے احسن طریقے سے خیال رکھا جا رہا ہے‘ حالانکہ اس علاقے میں ایک بھی مسلمان آباد نہیں۔ جس کمرے میں یہ قبر واقع ہے اس کے طاقوں میں ہندوؤں نے اپنے بُت بھی سجا رکھے ہیں۔ مزاروں اور قبروں کی بے حرمتی تو وہ بھی نہیں کرتے‘ بلکہ وہ تو مزاروں کی زیارتیں بھی کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے ووٹ کے استعمال نے آج تک منفی نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔ ایک الیکشن میں نس بندی کے ایشو پر مسلمانوں کا ووٹ تقریباً یکجا ہو کر اندرا گاندھی کے خلاف کاسٹ ہو گیا تھا‘ جس کے سبب اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اگلے الیکشن میں اُس نے ہندی کارڈ کھیلا اور یوں ہندو جذبات کو اپیل کر کے وہ جیت گئی۔ اسی سے یہ بی جے پی کا سارا ہنگامہ کھڑا ہوا‘ ورنہ اس سے پہلے تو بھارتیہ جنتا پارٹی کی بھارتی سیاست میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان اپنے ووٹ کے ذریعے اس قدر مؤثر ہو سکتا ہے تو انہوں نے اکثریتی ووٹ کو ہندومت کے نام پر اپیل کیا۔ اس کے بھارتی سیاست پر دُور رس اثرات مرتّب ہوئے اور بی جے پی ایک بھرپور سیاسی قوت بن کر اُبھری۔ یوں مسلمانوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہو گیا۔

بھارتی مسلمانوں کی خدمت میں چند گزارشات

اس صورت حال میں کیا خطرات مضمر ہیں‘ ان کے حوالے سے اب مجھے کچھ باتیں عرض کرنی ہیں۔ گو یہ باتیں بظاہر باریک اور چھوٹی نظر آتی ہیں‘ لیکن بسا اوقات بڑے بڑے دانشوروں کے لیے بھی سمجھنی مشکل ہو جاتی ہیں۔ ہمیں اپنی بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ کیا عجب اللہ تعالیٰ ان باتوں کے لیے لوگوں کے سینوں کو کھول دے۔

مَیں آپ کی توجّہ ایک مرتبہ پھر علّامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں‘ جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ سیکولرازم ہندو کی ضرورت ہے‘ اس لیے کہ ہندو کوئی قوم ہیں ہی نہیں۔ ہندوؤں میں تو چار ورن برہمن‘ کھشتری‘ ویش اور شودر ہیں۔ ان کے درمیان تو ایسے ایسے فاصلے ہیں جن کو عبور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جو برہمن پیدا ہوگا وہ برہمن ہی مرے گا۔ اسی طرح جو کھشتری‘ ویش یا شودر پیدا ہوگا وہ کھشتری‘ ویش اور شودر ہی مرے گا۔ لہٰذا وہ ایک قوم کیسے ہو جائیں گے؟ اسی وجہ سے انہیں ایک قوم بننے کے لیے سیکولرازم کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس مسلمان تو ایک قوم ہیں۔ جب مسلمان سیکولرازم کا نعرہ لگاتے ہیں تو بنیاد پرست اور انتہا پسند ہندو تنظیمیں اِس سے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ اس میں یقیناً مسلمانوں کا فائدہ اور ہمارا نقصان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں انتہا پسند ہندو تنظیموں کے ذریعے سیکولرازم کے خلاف ایک تحریک پروان چڑھ رہی ہے۔ اس صورت حال میں بھارتی مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک اقلیت کا کردار ادا کریں۔ وہ اس بات کا واضح طور پر اعلان کریں کہ ہم ایک علیحدہ قوم ہیں‘ اور اس فریم ورک میں رہتے ہوئے اپنے حقوق کی گارنٹی کا مطالبہ کریں۔ اپنے حقوق کے ضمن میں اگر کوئی دست اندازی اور مداخلت ہو تو ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار کریں۔

اگرچہ عائلی قوانین کے ضمن میں مسلمانوں نے اس بات کو منوا کر چادر اور چار دیواری کا تحفّظ تو کر لیا ہے‘ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ سیکولرازم کے زیر اثر مسلمان دانشوروں کا ایک خاصا بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو کامن سول کوڈ کا طرف دار بنا ہوا ہے۔ اس غیر تسلّی بخش صورت حال کے باوجود مَیں نے اپنے حالیہ سفر بھارت کے دوران وہاں

کے مختلف مسلمان صحافیوں‘ سیاست دانوں اور اکابرین سے مفصّل گفتگوئیں کی ہیں۔ ڈاکٹر سلمان حسینی ندوی جو مولانا علی میاں کے بڑے بھائی کے نواسے ہیں اور انہیں مولانا کے جانشین کی حیثیت حاصل ہے‘ ان سے بھی بڑی مفصّل گفتگوئیں ہوئیں۔ جماعت اسلامی ہند کی چوٹی کی قیادت سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور گفتگوئیں رہیں۔ سید شہاب الدین صاحب ایک اہم مسلمان رہنما ہیں جن کا بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازعے میں بڑا اہم رول ہے‘ ان سے بھی بڑی مفصّل ملاقات ہوئی۔ دیوبندی حلقہ کے تھانوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے بعض علماء سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت کے ساتھ اُن کے سامنے رکھا ہے‘ لیکن تاحال اُن کا جواب حوصلہ افزا نہیں۔ تاہم میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گا۔

اس ضمن میں سب سے اہم لیکن ذرا مختلف رول جماعت اسلامی ہند کا رہا ہے۔ جماعت اسلامی جب ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی تو وہ اپنے نظریات کے اعتبار سے بڑی اصولی اور انقلابی جماعت تھی۔ اس کا واضح موقف تھا کہ جہاں پر اللہ کی حکومت نہیں ہے وہ نظام طاغوت ہے‘ لہٰذا ایسے نظام کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس کا نہایت درست اور اصولی موقف تھا‘ کیونکہ اگر آپ کسی طاغوتی نظام کے تحت الیکشن میں حصّہ لیں گے تو یہ طاغوت کے ساتھ تعاون کے مترادف ہے۔ ایسے نظام میں حکومت کی ملازمت اختیار کرنا بھی اس کا سہارا بننے کے ذیل میں آئے گا۔ چنانچہ تقسیم سے قبل جماعت اسلامی کے نزدیک انگریزی حکومت کی ملازمت‘ ماسوائے دو محکموں تعلیم اور ڈاک کے‘ حرام تھی۔ خاص طور پر عدلیہ کا محکمہ جہاں فیصلے غیر اللہ کے قانون کے تحت ہوتے ہوں‘ اس میں ملازمت بھی حرام تصوّر کی جاتی تھی اور وکالت کا پیشہ بھی۔ آج آپ کو جماعت اسلامی کا یہ موقف بڑا عجیب محسوس ہو رہا ہوگا کہ معلوم نہیں یہ کون سی دنیا کی باتیں ہیں‘ لیکن ذرا ماضی میں جھانکئے تو آپ کو جماعت کا یہی اصولی موقف نظر آئے گا۔

تقسیم کے بعد پاکستان آ کر جماعت نے اپنی کیفیت بدلی اور اپنے اصولی موقف سے انحراف کرتے ہوئے ایک سیاسی جماعت کا رول اختیار کر لیا۔ اس کے برعکس جماعت

اسلامی ہند اپنے بنیادی اصولی موقف پر کافی عرصہ تک قائم رہی ہے اور ایک ایسے سیاسی نظام میں جہاں اللہ کی حاکمیت تسلیم نہیں کی گئی' الیکشن لڑنا حرام سمجھتی رہی ہے۔ اب وہ بھی اس عذر کے ساتھ ڈھیلی پڑ گئی ہے کہ حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں' اب کیا کریں۔ ایک طرف ہندومت کے احیاء (revivalism) کا مہیب خطرہ ہے تو دوسری طرف سیکولر طاقتیں ہیں جو کم از کم ہندو بالادستی کی تو علَم بردار نہیں ہیں۔ لہٰذا اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ الیکشن میں تو حصّہ نہیں لیا جائے گا' لیکن ووٹ دینے کی حد تک اپنے اراکین کو آزادی دے دی ہے۔ جماعت کے مختلف رہنماؤں سے جو میری گفتگو ہوئی تو ان کا کہنا یہ تھا کہ سیکولرازم کا جو مفہوم آپ لیتے ہیں وہ ہمارے اخذ کردہ مفہوم سے مختلف ہے۔ لیکن جب تفصیل سے گفتگو ہوئی تو بات وہی نکلی۔ اس پر مَیں نے عرض کیا کہ یہی تو سیکولرازم ہے۔ سیکولرازم کا مطلب ایک ہی ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مذہبی معاملات میں آزادی۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ بھارت میں ہندوؤں کی عظیم اکثریت کے پیش نظر حکومت ہندو تہذیب اور کلچر ہی کا فروغ چاہے گی۔ اصولی طور پر ہندومت' اسلام' عیسائیت اور دیگر مذاہب آئین اور قانون کے اعتبار سے وہاں برابر (at par) ہیں۔

اسی طرح امریکہ میں بھی تمام مذاہب آئین اور قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہودیوں کو امریکہ میں اس درجے مؤثر ہونے کا موقع ہی نہ ملتا۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں تو اتنی دشمنی تھی کہ ایک شخصیت (عیسیٰ علیہ السلام) جنہیں عیسائی خُدا مانتے ہیں یہودی انہیں مرتد اور واجب القتل قرار دے کر اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا چکے تھے۔ یہودی انہیں آج تک (معاذ اللہ!) ولد الحرام کہتے ہیں۔ لہٰذا جب تک یہودی تمام مذاہب کو سائیڈ لائن کر کے سیکولرازم نہ لاتے تب تک اُن کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ وہ یوں امریکہ پر مسلّط ہو کر بیٹھتے۔ چنانچہ سیکولرازم درحقیقت یہودی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کی رو سے مذہب اور عقیدے کو ایک طرف رکھ دیا گیا کہ یہ تو ہر فرد کا انفرادی معاملہ ٹھہرا' لیکن جہاں تک اجتماعی نظام کا تعلق ہے وہ سیکولرازم کی بنیاد پر بنے گا۔ چنانچہ اسی سبب سے اُن کے لیے راستے کھلے اور اسی کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں میں مفاہمت پیدا ہوئی۔ یہی کچھ

بھارت میں بھی ہو رہا ہے اور ہندو کلچر اور تہذیب اسی راستے سے پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ تو سیکولرازم دو نہیں درحقیقت ایک ہی ہے' اور یہ اسلام کی نفی ہے۔

اسلام کو ''مذہب'' بنا دیجیے تو یہ دس مذہبوں کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے' لیکن اسلام کو اگر ''دین'' مانیں گے تو ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ دین تو ایک ہی ہوگا' دو ہو نہیں سکتے۔ ایک ہی ملک میں بیک وقت اشتراکی نظام بھی ہو اور سرمایہ دارانہ نظام بھی' ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ یہ تو ناممکنات میں سے ہے۔ نظام تو کسی ملک میں ایک ہی ہوگا۔ لہٰذا اسلام کو جب آپ دین مانیں گے تو وہ کسی قسم کی شراکت گوارا نہیں کرے گا:

باطل دوئی پسند ہے' حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

البتہ اسلامی ریاست میں ﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾﴾ (التوبۃ) کے مصداق ہاتھ سے جزیہ دے کر چھوٹے بن کر رہنے والوں کو مذاہب کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے گا' دین کی حیثیت سے نہیں۔

بھارت میں تبلیغ اسلام کا صحیح منہج

بھارت کے مسلمان راہنما ایک بات یہ کہتے ہیں کہ ہندو معاشرے کی اونچ نیچ کے پیش نظر اُن کے لیے یہ بڑا آسان موقع ہے کہ وہ اس تفریق کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے مقابل اسلام کے اصولِ اخوت و مساوات کو نمایاں کریں۔ اس طرح انہیں نچلی ذاتوں میں تبلیغ کرنے کا بڑا اچھا موقع میسّر آ جائے گا۔ اس ضمن میں مَیں نے عرض کیا کہ اسلام کا تبلیغی مزاج ہرگز یہ نہیں ہے کہ گرے پڑے طبقوں کو ٹارگٹ بنایا جائے۔ ایسا انداز اُن مذاہب کا ہوتا ہے جن کے پاس کوئی دلیل نہ ہو۔ اسی سبب سے عیسائیت کا طریقہ کار یہ ہے کہ گرے پڑے پس ماندہ طبقات میں بسکٹوں اور گھی کے ڈبے وغیرہ تقسیم کر دیے جائیں اور ان کی بچیوں کی تعلیم کا کچھ بندوبست کر دیا جائے تاکہ وہ نرسیں بن جائیں۔ اسی طرح اُن کے نام بدل دیے جائیں۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا تبلیغ کر سکتے ہیں؟ اس کے برعکس اسلام کا کبھی بھی یہ معاملہ نہیں رہا۔ اسلام تو دلیل کے ساتھ اور اونچے طبقے کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ﴾ (یوسف:۱۰۸) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے یہ ہے میرا راستہ‘ مَیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر‘ مَیں بھی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے۔'' مَیں جو بات کہہ رہا ہوں علیٰ وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں اور دلیل کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ اسلام کا چیلنج تو یہ ہے: ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۱۱﴾ (البقرۃ) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ لے آؤ اپنی سند اگر تم سچے ہو۔'' اگر تمہارے پاس کوئی دلیل موجود ہے تو پیش کرو۔ مشنری طرز کا اندازِ تبلیغ درحقیقت اسلام کا نہیں‘ عیسائیت کا تصوّر ہے۔ البتہ اس اعتبار سے ہندوستان میں اگر مسلمان بادشاہوں نے اپنے دَورِ حکومت میں نچلے طبقات کی کسی درجے میں حوصلہ افزائی کی ہوتی تو اُن کی اکثریت مسلمان ہو جاتی۔ بہرحال اب وہ حالات نہیں رہے۔ لہٰذا اب اگر آپ کو ازسرِنو تبلیغ کرنی ہے تو دلیل کی طاقت سے کیجیے اور اونچے طبقے سے بات کیجیے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مصر بھیجا تو گلی گلی تبلیغ کے لیے نہیں‘ بلکہ حکم ہوا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۱۷﴾ (النّٰزعٰت) ''(اے موسیٰ!) فرعون کی طرف جاؤ‘ اُس نے سرکشی اختیار کی ہے۔'' اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ طائف تشریف لے گئے تو وہاں جا کر گلیوں میں تبلیغ کرنے کی بجائے آپؐ نے وہاں کے تین بڑے سرداروں سے ملاقات کی۔ جہاں تک مکہ کا معاملہ تھا‘ اگرچہ وہاں آپؐ نے ہر سطح پر تبلیغ کی ہے لیکن سب سے پہلے بنو ہاشم کے چوٹی کے سرداروں کو جمع کیا اور اُن کے سامنے اپنی دعوت رکھی۔ آپ ﷺ جہاں بھی پہلی مرتبہ تشریف لے گئے وہاں عوام کے بجائے خواص سے بات کی ہے۔ مَیں نے اپنے گزشتہ دورۂ بھارت میں مولانا علی میاں کی خدمت میں گزارش کی تھی کہ آپ اپنے دارالعلوم میں سنسکرت کی تعلیم کا اہتمام بھی کیجیے‘ تاکہ آپ ایسے علماء تیار کر سکیں جو ہندو مذہب‘ ہندو ذہن اور ہندو فکر و فلسفہ کو اس کے براہِ راست مآخذ (direct sources) سے سمجھ سکیں۔ جب تک آپ ہندو ذہن کو نہیں سمجھیں گے‘ اُسے اپیل کیسے کریں گے! یہی بات اس مرتبہ میں جماعت اسلامی ہند کے اکابرین کے بھی گوش گزار کر

کے آیا ہوں کہ اگرچہ آپ بھارت میں بولی جانے والی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم‘ رسائل و جرائد کے اجراء اور دیگر دینی لٹریچر کی اشاعت کے ذریعے یقیناً ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں‘ لیکن ہندو ذہن بنیادی طور پر منطقی اور فلسفیانہ ہے‘ لہٰذا اُسے approach بھی اُسی راستے سے کیجیے۔ تبھی اونچے طبقے کا ہندو آپ کی بات سنے گا۔ اگر آپ نچلے طبقے کو ہی ہدف بنائیں گے تو تامل ناڈو جیسے واقعات ہوتے رہیں گے‘ جہاں نچلے طبقے کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تھے تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا ردِّعمل یہ ہوا کہ ہندوؤں نے جوابی تحریک کے ذریعے راجستھان میں بے شمار مسلمانوں کو شودر بنا دیا اور یوں لینے کے دینے پڑ گئے‘ کیونکہ مسلمانوں میں بھی تو ایسے بے شمار طبقات موجود ہیں جنہیں دین کی کوئی شُدبُد نہیں۔ اندریں حالات مَیں نے اُن سے گزارش کی کہ نچلے طبقات کو ہدف بنانے کی بجائے اونچے طبقات کے ہندوؤں کے سامنے اپنی دعوت رکھیں اور اس حوالے سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی یہ پیشین گوئی آپ کے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ''ایک وقت آئے گا جب ہندوستان کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی۔'' لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہو گا جب ''کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ'' کے مصداق اُن سے اُن کی ذہنی سطح کے مطابق یعنی فلسفیانہ انداز میں اور حکمت کے ساتھ بات کی جائے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ﴾ (النحل:۱۲۵)

''آپؐ بلایئے لوگوں کو اپنے ربّ کے راستے کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سنا کر‘ اور بحث و مناظرہ کیجیے اُن سے بہترین انداز سے۔''

اہلِ پاکستان کے لیے لمحۂ فکریہ

یہ وہ چند باتیں تھیں جو میں نے ڈرتے ڈرتے اور ایک عرصے کی ہچکچاہٹ کے بعد بھارتی مسلمانوں کے سامنے رکھی ہیں‘ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے پیشتر میری زبان ہی نہیں کھلتی رہی۔ اس لیے کہ اُن کو کوئی مشورہ دینے سے پہلے ہمیں اپنا دامن دیکھنا چاہیے کہ ہم

نے پاکستان میں کیا کیا۔ وہی مغرب کا جمہوری نظام‘ وہی سود پر مبنی بینکنگ‘ وہیں جوا اور سٹّہ اور وہی جاگیرداری ہم سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اہلِ بھارت نے کم از کم جاگیرداری کا جنازہ تو آزادی کے فوراً بعد ہی نکال دیا تھا‘ لیکن ہمارے ہاں تو یہ سب سے بڑا عفریت آج بھی دندنا رہا ہے اور اسی طرح قائم و دائم ہے۔ چنانچہ بھارت کا مسلمان بھی ہم سے بازی لے گیا ہے اور وہاں کا ہندو بھی۔ البتہ سرمایہ داری کی لعنت وہاں بھی ہے‘ یہاں بھی ہے۔ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے جبکہ حکومتی سطح پر جو اقدامات ہو رہے ہیں اور اسمبلیوں میں جو کارروائیاں ہو رہی ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے پر الزام تراشی کر رہا ہے۔ وہ خود اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم سب لٹیرے ہیں۔ بس اس سے آگے اور کوئی دلیل نہیں کہ ’’ہم نے لوٹا تو تم نے بھی تو لوٹا!‘‘ گویا اِس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ اس لوٹ کھسوٹ کا کیا نتیجہ نکلے گا: ؎

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

اس تشویش ناک صورتِ حال کے پیش نظر میری آپ سے گزارش ہے کہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں‘ سوئے نہ رہیں۔ ع ’’دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!‘‘ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ نظام کو بدلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ڈھائی سو برس پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ یہ الفاظ کیسے کہہ گئے کہ ’’فکُّ کُلِّ نِظَامٍ‘‘۔ دراصل یہ وہ نابغہ شخصیات ہوتی ہیں جو علمی اور فکری میدان میں قوم کی راہنمائی کرتی ہیں۔ میں علّامہ اقبال کا حوالہ دیتا ہوں‘ ان سے پہلے اس برعظیم پاک و ہند میں علمی و فکری میدان میں نہایت جامع اور پورا شعور رکھنے والی شخصیت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ہے۔ علّامہ اقبال نے موجودہ دَور میں مغرب کے فکر اور فلسفے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں‘ جبکہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے دَور میں اسلام کی ایک مستحکم اور مثبت تعبیر کر گئے‘ کیونکہ اُس دَور میں ابھی مغربی فکر و فلسفہ تو آیا ہی نہیں تھا۔ اسی اعتبار سے فکُّ کُلِّ نِظَامٍ کا حوالہ میں نے آپ کے سامنے رکھا۔ باطل نظام کے تار و پود بکھیرے بغیر تو حق کا نظام قائم ہونا ممکن نہیں ہے۔

نظامِ خلافت کے خدوخال

ہم نے تحریکِ خلافت کا آغاز کیا ہے تو اگرچہ ابھی تک کوئی major break through تو نہیں ہوا لیکن ایک چہ میگوئی ضرور شروع ہو گئی ہے‘ ہلچل سی ہے کہ یہ خلافت کی بات کدھر سے آ گئی! اس کا مطلب کیا ہے؟ وغیرہ۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ آغاز میں کچھ مغالطے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہا جا رہا ہے کہ نظامِ خلافت کے قیام سے شاید ہماری مراد مُلّاؤں کی حکومت (theocracy) کا قیام ہے۔ دراصل یہ چیز ذہنوں سے محو ہو چکی تھی‘ لہٰذا اس کا نام اب لوگوں کے لیے غیر مانوس سا ہے۔ اسی طرح کی صورتِ حال کا سامنا ہمیں اُس وقت بھی کرنا پڑا تھا جب ہماری طرف سے بیعت کا لفظ سامنے آیا تھا‘ گویا ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں جو بھی اندیشے یا مغالطے تھے وہ دُور ہو گئے۔ اسی طرح خلافت کا لفظ آیا ہے تو اس پر بھی لوگ چونکے ہیں۔ لہٰذا ہمیں مسلسل محنت اور جِدّوجُہد سے ان مغالطوں اور شکوک و شبہات کو دُور کرنا ہے۔

اس ضمن میں چند باتیں مَیں دانشور حضرات کو نوٹ کرانا چاہتا ہوں۔ اوّلاً یہ کہ جہاں تک لفظ خلافت کا تعلق ہے یہ صرف حاکمیت (sovereignty) کے مقابلے میں ہے۔ اسلام میں حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے‘ انسان کے لیے نہیں۔ انسان کے لیے خلافت ہے۔ اس کے برعکس جمہوریت کا اصول عوامی حاکمیت ہے۔ اسلام میں حاکمیت کا لفظ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے استعمال کرنا کفر ہے۔ اسی بات کے پیش نظر جمہوریت کے ساتھ ’’اسلامی‘‘ کا لفظ لگایا جاتا تھا اور ’’اسلامی جمہوریت‘‘ کا مطلب اللہ کی حاکمیت کے تحت جمہوری اور شورائی نظام لیا جاتا تھا۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب ہمارے دین میں اس کے لیے صحیح (proper) اصطلاح موجود ہے تو کیوں نہ اسے اختیار کیا جائے۔ ثانیاً اس سے ہماری مراد وہ مکمل سیاسی‘ معاشی اور سماجی نظام ہے جس کا مظہرِ کامل و اَتم خلافت راشدہ تھی۔ اسی لیے ہم نے نظامِ خلافت کے دس نکات معیّن کیے ہیں جو سیاسی‘ معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

تیسری اہم بات جو مَیں نوٹ کروانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ تو اَب جوں

کی توں قائم ہونہیں سکتی۔ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تربیت یافتہ لوگوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کے ذریعے قائم ہوئی تھی۔ گویا وہ دورِ نبوت کا ایک ضمیمہ تھی۔ اُس وقت دلیل یہ نہ تھی کہ ''ایک آدمی ایک ووٹ'' کے ذریعے خلیفہ کا انتخاب عمل میں لایا جائے' بلکہ دلیل یہ تھی کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قریبی ساتھی کون ہے! ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ (الفتح:۲۹)۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا تو یہ نہیں کہا کہ بڑے سمجھ دار ہیں' بڑے فہیم اور زیرک ہیں' بلکہ یہ کہا: ''یہ عمرؓ موجود ہیں' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دنیا سے اِس حال میں تشریف لے گئے تھے کہ اِن (عمرؓ) سے راضی تھے' لہٰذا ان کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔'' موجودہ دَور میں یہ دلیل اب کسی کے لیے نہیں۔ اس کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی ایک درجہ بندی تھی۔ یعنی پہلے عشرۂ مبشرہ' پھر اصحابِ بدر' پھر اصحابِ بیعتِ رضوان۔ اس درجہ بندی کا بھی اب کوئی سوال نہیں۔ اسی طرح اُس دَور میں قبائلی نظام تھا جو اَب موجود نہیں۔ اس اعتبار سے خلافت راشدہ کا نقشِ ثانی (replica) تو ممکن ہی نہیں۔ عصرِ حاضر میں خلافت کا جو نظام بنے گا اُس میں دورِ خلافت راشدہ سے راہنما اصول لے کر اُن کے ساتھ دَورِ جدید کے تقاضوں اور عمرانی ارتقاء (social evolution) کو سمویا جائے گا۔ علّامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں کہا تھا کہ اسلام کا نظامِ حکومت republican نوعیت کا ہے۔ ایسا طرزِ حکومت دنیا کو تو آج نظر آیا ہے' جبکہ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی جھلک تو دنیا دورِ خلافتِ راشدہ میں دیکھ چکی ہے۔ آج ہمیں نظام خلافت کو دَورِ حاضر کے اعلیٰ ترین تقاضوں کے مطابق develop کرنا ہوگا۔

اس نظام کے نمایاں ترین خصائص انسانی حاکمیت کی نفی' کتاب وسُنّت کی بلا استثناء مکمل بالادستی اور کفالتِ عامہ کے نظام کے تحت عوام کی بنیادی ضروریات کی کفالت ہیں۔ علاوہ ازیں دستور سازی کے عمل میں صرف مسلمان حصّہ لے سکیں گے اور خلیفہ صرف مسلمان مَرد ہوگا۔ یہ ہیں نظامِ خلافت کے بنیادی خدوخال! اِس نظام کے قیام کے لیے خلوصِ نیت کے ساتھ کوشش اور جِدّوجُہد ہمارا فرض ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت بھی اِن شاء اللہ ہمارے شاملِ حال ہوگی۔

آج معاملہ صرف پاکستان کا نہیں بلکہ کم ازکم پورے برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کے فرضِ کفایہ کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے۔ اگر ہم اس فرض کی ادائیگی میں مزید کوتاہی کے مرتکب ہوئے تو پھر اللہ کے بھی مجرم ٹھہریں گے اور ان کے بھی جنہوں نے ہمیں پاکستان بنوا کر دے دیا تھا۔ چنانچہ اب کمرِ ہمّت کسنے کی ضرورت ہے۔ اس تحریک سے تعاون کے لیے آگے بڑھیے۔ نظامِ خلافت کے قیام سے ہم اسلام کے اصل نظام کا وہ نمونہ دنیا کو دکھا سکیں گے جس کا خواب کبھی علّامہ اقبال اور قائداعظم نے دیکھا تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں انفرادی توبہ کرنے کی بھی فوری توفیق عطا فرمائے اور اجتماعی توبہ کے لیے بھی اپنا تن' من' دھن وقف کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

بقیہ: عرضِ احوال

کہ کبھی ایسا موقع بھی آسکتا ہے کہ پیچھے فرعون اور آگے سمندر ہو' یا آپ اور آپ کے جانی دشمنوں کے درمیان صرف مکڑی کا ایک نازک جالا ہی ہو' تو ایسے نازک حالات میں تمام مادی ذرائع کو نظر انداز کرنا پڑ جائے اور صرف صرف اپنے رب پر ہی توکّل انسان کا واحد سہارا بن جائے۔

اس کے لیے دو مثالوں کا سامنے رہنا ضروری ہے۔ ایک ماضی کی جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے تمام مادّی وسائل اور عقلی دلائل کو مسترد کرتے ہوئے حق کی خاطر آگ میں کودنا قبول کرلیا اور پھر ربّ تعالیٰ کے محض ایک اشارے پر اپنے بڑھاپے کی واحد اولاد کی گردن پر چھری چلا دی تو اللہ تعالیٰ نے بھی رہتی دنیا تک اُن کی سُنّت کو جاری وساری فرما دیا۔ اور دوسری مثال جدید دور میں سُنّتِ ابراہیمی کی اصل روح کو زندہ کرتے ہوئے افغان طالبان اسلامی نظام کے قیام کی خاطر انسانی تاریخ کی سب سے بڑی مادی طاقت سمیت پوری دنیا کی دشمنی کی آگ میں بے خطر کود پڑے' گویا موت کی وادی میں اُترنا خود ہی قبول کرلیا۔ لیکن کیا عجیب ''حادثہ'' پیش آیا اور کیسا ''اتفاق'' ہے کہ دنیا نے آج کے جدید مادی دور میں جب ٹیکنالوجی اپنے عروج پر ہے' کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ پر مکمل توکّل سے کیسا معجزہ رونما ہوجاتا ہے۔ ؎

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا!

❁❁❁

سیرت خلیفہ ثانی سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

سیّدہ حفظہ احمد

کیا آپ ایسے شخص کو جانتے ہیں:

☆ جو عرب کے سترہ پڑھے لکھے لوگوں میں شمار ہوتا ہو؟

☆ جو اسلام سے پہلے نبی اکرم ﷺ کے خلاف بولتا ہو، دل میں بغض لیے کہتا ہو کہ یہ تو شاعر ہے (نعوذ باللہ من ذلک) تو قرآن جیسی مقدّس کتاب اس کا جواب دیتی ہو کہ ''وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ''۔ جب وہ سوچتا ہو کہ یہ تو بڑا کاہن ہے (نعوذ باللہ من ذلک) تو قرآن پھر جواب دیتا ہو ''وَمَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ''۔ پھر اس کے دل میں اسلام کا رعب و دبدبہ پیوست ہو جاتا ہو؟

☆ جو نبی ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلا ہو، لیکن سورۃ طٰہٰ کی آیت ﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ﴾ سن کر کانپ جاتا ہو، دوڑتا ہوا نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ہو کہ آج میں بُری نیّت لے کر نہیں آیا؟

☆ جو نبی ﷺ کی دعاؤں کا ثمر اور ''مرادِ رسولؐ'' ہو؟ جس کے قبولِ اسلام کے لیے نبی مکرم ﷺ نے اس کا نام لے کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہو؟

☆ جس کے اسلام قبول کرنے کے بعد دین کو تقویت ملی ہو، جس کا ایمان لانا مسلمانوں کی عزّت کا سبب بنا ہو؟

☆ جس نے علی الاعلان کعبہ کی چھت پر پہلی بار اذان دی ہو؟

☆ جو اسلام سے پہلے اپنے رعب سے متاثر کرتا ہو، لیکن اسلام لانے کے بعد نبی عربی ﷺ کا خادم بن گیا ہو؟

☆ جو اسلام قبول کرنے کے بعد ایک ایک کافر کے گھر جا کر اُسے پکار پکار کر بتاتا ہو کہ مَیں اسلام

قبول کر چکا ہوں اور اعلان کرواتا ہو کہ جس نے اپنی بیوی کو بیوہ، بچوں کو یتیم کرنا ہو، ماں باپ کی کمر کو جھکانا ہو تو وہ عمر کے مقابلے میں آئے؟

☆ جس کو دیکھ کر شیطان اپنا راستہ بدل لیتا ہو؟

☆ جو اس بات کے ڈر سے قرآن کی تدوین کا مشورہ دیتا ہو کہ قرآن میں پہلی کتابوں کی طرح تحریف نہ ہو جائے اور ہم اصل میں ملاوٹ کر بیٹھیں؟

☆ جس کی خلافت مسلمانوں کے لیے رحمت شمار کی جاتی ہو؟

☆ جس نے بائیس لاکھ مربع میل پر حکومت کی ہو اور عدل کی وجہ سے مشہور ہوا ہو؟

☆ جس کے جاہ و جلال کی وجہ سے زمین کانپتے ہوئے سہم گئی ہو؟

☆ جس نے رُکے ہوئے دریائے نیل کے نام خط لکھا ہو اور اس کی وجہ سے دریائے نیل جاری ہو گیا ہو؟

☆ جو خلیفہ ہوتے ہوئے بھی پیوند لگے کپڑے پہن کر یہ سوچتا ہو کہ فرات کے پاس ایک کُتا بھی بھوکا مر جائے تو اس کا جواب دہ مَیں ہوں گا؟

☆ جو امیر المؤمنین ہوتے ہوئے رات کو بھیس بدل کر مدینے کی گلیوں میں گشت کیا کرتا ہو؟

☆ جو دن کو لوگوں کی مشکلات سنتا ہو اور رات کو چھپ کر ان کی مشکلات حل کیا کرتا ہو؟

☆ جو کیکر کے درخت کے نیچے تکیے کی جگہ اینٹ لگا کر سونے کو ترجیح دیتا ہو؟

☆ جو صاحب الہام ہو، جسے یہ معلوم ہو جائے کہ بکری کی ٹانگ پل پر ٹوٹ گئی ہے اور اس بات پر روتا ہو کہ اب اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ تُو نے پُل ٹھیک کیوں نہ کروایا؟

☆ جو بچوں اور ان کی ماں کی خبر گیری کرنے کے بعد عورت کی بات پر اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہو کہ جب تو کل امیر المؤمنین سے ملے گی تو مجھے بھی وہاں پالے گی؟

☆ جو امیر المؤمنین ہوتے ہوئے بھی مسجد میں جھاڑو دیتا ہو، بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرنے، ان کا سودا سلف لینے جاتا ہو، ان کے اونٹ چراتا ہو؟

☆ جو خود بیت المال کا اونٹ تلاش کرنے نکلا ہو اس غرض سے کہ معلوم نہیں اس میں کتنے لوگوں کا حق ہو گا؟

☆ جس نے دس سال، چار ماہ، دس دن کی سلطنت امامِ عادل کی حیثیت سے نظم و ضبط سے قائم کی ہو؟

☆ جو یہ کہتا ہو کہ تم لوگوں کو کیسے غلام بنا سکتے ہو جب کہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے؟

☆ جس کے بارے میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہوں کہ اس (عمرؓ) کا تذکرہ کیا کرو، کیوں کہ اس (عمرؓ) کا تذکرہ ہوتا ہے تو عدل کا تذکرہ ہوتا ہے، جب عدل کا تذکرہ ہوتا ہے تو اللہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔

☆ جس نے ایران، عراق، شام اور مصر فتح کیا ہو؟

☆ جس کو دُنیا میں ہی جنت کی بشارت مل گئی ہو؟ جس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں ایک خوب صورت محل بھی دیکھا ہو؟ اس کے بعد بھی وہ وقت نزع کے وقت یہ کہتا ہو: ویلٌ لك یا عمر، ان لم یغفر لك ربك ''تمہارے لیے تباہی ہے اے عمر! اگر تجھے تیرے ربّ نے نہیں بخشا؟''

☆ جس نے سب سے پہلے باقاعدہ فوج کا محکمہ قائم کیا ہو؟ فوجیوں کے وظائف مقرر کیے ہوں؟

☆ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بائیں پہلو میں تدفین کی اجازت طلب کی ہو اور کہا ہو کہ امیر المؤمنین کہہ کر نہ پوچھنا؟

☆ جس کا دورِ خلافت اسلام کا سنہری دور کہلاتا ہو؟

ہاں ہاں! یہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں.....

☆ جن کی پیدائش ۵۸۶ء تا ۵۹۰ء کے درمیان مکہ میں ہوئی تھی (ایک روایت کے مطابق ہجرت سے چالیس سال قبل آپ کی پیدائش ہوئی) اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تیرہ برس چھوٹے تھے۔

☆ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خسر ہیں (بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں تھیں)۔

☆ جو دامادِ علی رضی اللہ عنہ ہیں (بی بی کلثوم رضی اللہ عنہا آپؓ کے نکاح میں تھیں)۔

☆ جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاروق اعظم کا لقب دیا۔

☆ جن کی کنیت ابوحفص رضی اللہ عنہ تھی۔

☆ جن کی وجہ سے دین اسلام کو تقویت ملی، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جن کی جان حاضر تھی، جو فطرتاً سخت مزاج تھے، لیکن خلیفہ بن کر اتنے نرم ہو گئے تھے کہ ان کی ہیبت اب کفار کے دلوں میں رچ بس گئی تھی۔

☆ جو سادگی و اخلاق کے پیکر تھے۔

☆ جو خلیفہ ثانی تھے اور تیرہ ہجری سے چوبیس ہجری تک انہوں نے بائیس لاکھ مربع میل پر حکومت کی۔

☆ جنہوں نے ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس میں انسانی ہمدردی، عوامی فلاح و بہبود، زراعت کی ترقی اور خصوصاً عدل و انصاف جیسے اصولوں کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

☆ جن کا نظام حکومت ایسی خوبیوں کا نمونہ تھا جس میں حاکم، امیر، عادل، اور دیگر عہدے دار اور خود خلیفہ لوگوں کے سامنے جواب دہ ہوں۔

☆ جن میں سادگی، عدل و انصاف، رواداری، انتظامی معاملات میں سختی نمایاں تھی۔

☆ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے اگر اس دنیا میں ایسا ایک اور عمر پیدا ہو جاتا تو پوری دنیا پر مسلمانوں کی حکومت ہوتی۔

☆ جن کو خنجر سے ۲۷ ذی الحجہ ۲۳ ہجری میں ایسا زخمی کیا گیا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور بالآخر یکم محرم الحرام ۲۴ ہجری کو جامِ شہادت نوش فرمایا۔

آج تک عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسا بیٹا نہ کسی ماں نے پیدا کیا، اور نہ ہی پیدا ہو سکے گا۔

شاعر نے کیا خوب قلم بند کیا ہے:

بیانِ حق کے ہنرور، ترے ہنر پہ سلام! — زبانِ عدل سے پھوٹی ہوئی سحر پہ سلام!
بہ ایں شرف بھی تو لاکھوں سے منفرد ہے عمر — مکین گنبد خضریٰ، ترے نگر پہ سلام!
ہے اہلِ بیت مقدّس میں جس کی بیٹی بھی — رسولِ پاکؐ کے اس محترم سسر پہ سلام!
درِ رسولؐ و ابوبکر پر سلام کے بعد — سلام جس کا ضروری ہے، اُس عمر پہ سلام!

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہمیں ان کی سیرت سے اسلام کو سیکھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، تاکہ ایسا عدل ہم اپنے معاشرے میں قائم کر سکیں کہ دشمن ہمیں بُری نگاہ سے نہ دیکھ سکے۔ آمین!

❁❁❁

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

تحریکِ مساواتِ مَردوزن
منزل بہ منزل

رضی الدین سیّد

تحریکِ مساواتِ مَردوزن جوآج دُنیا کی سب سے بڑی عفریت ثابت ہورہی ہے‘ اس کا آغاز تقریباً دوسوسال پہلے یورپ میں ہوا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہرمنفی تحریک کا آغاز سدا سے یورپ ہی میں ہوتا رہا ہے‘ کیونکہ مذہب ان کے ہاں ہمیشہ ہی ناقابلِ توجہ گردانا جاتا رہا ہے۔ اگر اس تحریک کا مرحلہ وار مطالعہ کیا جائے تو پتہ لگے گا کہ تحریکِ مساوات کے عَلَم بَرداروں کی جانب سے خواتین کے حق میں اٹھایا جانے والا ہر نیا قدم‘ ان کی قوم‘ ان کے معاشرے‘ مذہب‘ اور خود ان کی خواتین کے لیے اٹھائے گئے ہر پچھلے قدم سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہورہا تھا۔ بے راہ روی تحریک کے سرخیل حضرات اپنی دانست میں تو یہی سمجھتے رہے کہ وہ کامیابیوں سے دوچار ہورہے ہیں‘ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی اور معصوم خواتین کو بھی بدترین زوال سے دوچار کر رہے تھے۔ قصّہ اگرچہ بہت طولانی ہے لیکن تفہیم کی خاطر ذیل میں ان کے مرحلہ وار اقدامات کو نکات کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) حقوقِ نسواں کی تحریک کے لیے بنیادی کردار دراصل اُس دور کی برپا شدہ دو عالمی جنگوں نے ادا کیا تھا۔ محاذ پر جانے کے لیے محلّے محلّے ’’رنگروٹ مراکز‘‘ کھلے ہوئے تھے‘ کیونکہ میدان میں افرادی قوت کی شدید ترین ضرورت پائی جاتی تھی۔ لیکن جو مَرد بھی بھرتی ہوکر محاذ پر جاتے تھے‘ بہت کم ہی ایسے تھے جو زندہ بچ کر واپس آتے تھے۔ اور جو آتے بھی تھے تو بڑی تعداد اپاہج اور معذور ہوکر آتی تھی۔ ہر گھر کے ایک دو مَرد ضرور ان جنگوں میں کام آگئے یا ناکارہ ہوگئے تھے۔ چنانچہ تقریباً ہر گھر میں ماتم بپا تھا اور ہر گلی میں آہ و بکا جاری تھی۔ ایک دو ضعیف مَردوں کے علاوہ

Email:national.a.research@gmail.com

گھروں میں اب صرف تین چار خواتین اور چند چھوٹے بچے ہی باقی رہ گئے تھے۔ سب سے بڑا سوال ان زندہ رہ جانے والوں کے نزدیک ان کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا تھا۔ آمدنی اچانک جب صفر پر پہنچ جائے تو اتنا بڑا گھر کیسے اور کیونکر چلے؟ واضح رہے کہ اُس دور میں ’’خاندانی منصوبہ بندی‘‘ (Family Planning) جیسے عجیب وغریب لفظ سے پورا یورپ قطعی ناآشنا تھا۔ کُنبے تب بڑے بڑے ہی ہوا کرتے تھے۔

(۲) معاش کے بعد عورتوں کے سامنے ایک حقیقی سوال یہ بھی آن کھڑا ہوا کہ ان کے جسمانی تقاضے اب کون پورے کرے گا! کمروں میں بیویاں تو موجود تھیں لیکن جیون ساتھی موجود نہ تھے۔ جذبات تو آخر جذبات ہیں جو سب ہی کے اندر توانا ہوتے ہیں‘ مَرد ہوں یا عورت! چنانچہ اس خلا نے بھی ان کے اندر ایک قدم آگے بڑھانے کی انجانی اکساہٹ پیدا کی۔

(۳) سوئے اتفاق‘ یا حسنِ اتفاق‘ انہی دنوں یورپ میں صنعتی احیاء نے جنم لینا شروع کردیا تھا۔ کارخانوں میں کام کرنے والے کثیر افراد کی ضرورت ایک ساتھ پائی جاتی تھی۔ ملوں میں نصب بڑی بڑی مشینیں خود کو رواں دواں رکھنے کی خاطر افرادِ کار کی طلب رکھتی تھیں۔ چنانچہ جنگی بھرتی کے مراکز کی طرز پر صنعت کاروں نے ان مشینوں کے لیے بھی ’’رنگروٹ بھرتی‘‘ مراکز کھول دیے اور آواز لگائی کہ ’’جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں!‘‘

(۴) صدموں اور لاوارثیت کی ماری عورتوں کے لیے یہ گویا ایک قدرتی انعام تھا۔ پہلے تو روایتی شرم وحیا نے انہیں کھینچے اور باندھے رکھا۔ لیکن آخر کب تک؟ پیٹ تو حیلے بہانے نہیں سنتا‘ انگریزی محاورہ کہتا ہے کہ Hungry stomach has no ears۔ چنانچہ اپنے رزق کے حصول کی خاطر وہ آخرکار بے تابانہ باہر نکلیں۔ اس کے بعد تو پھر وہی اصول لاگو ہوگیا کہ ’’گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی عورت پر مصائب کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے‘‘۔ شیطان کا یہ عمل مستحکم ہے کہ وہ ہر عورت کے ساتھ چلتا ہے تاکہ اُسے بھی بہکائے اور سامنے آنے والے مَرد کو بھی ہنکا کے رکھے۔

(۵) عورت کو جب ہر ماہ لگی بندھی آمدنی ملنے لگی تو سکون و اطمینان کے جذبات کے ساتھ اندرونی طور پر اُس پر ایک گونہ خود اعتمادی کا احساس بھی طاری ہوا۔ دوسری طرف اس کے اندر اپنے ’’کچھ ہونے‘‘ کی قوت کا خیال بھی اجاگر ہوا۔ پہلے اگر وہ کچھ نہیں تھی تو اب وہ یکایک بہت کچھ بن گئی تھی۔ یوں ایک طرح کا بلاوجہ کا زُعم بھی اس میں اُبھرنا شروع ہوگیا۔

(۶) حاصل شدہ رقم سے ایک طرف اُس نے اپنے گھر کو چلانا شروع کیا اور دوسری طرف خود کو بنانا سنوارنا اور نکھارنا بھی۔ باہر کی دُنیا تو یوں بھی ہر ایک فرد سے بننے، سنورنے اور سجنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور معاملہ جب عورت کا ہو تو بات اس سے بھی کہیں آگے جا کر ٹھہرتی ہے۔ ہاتھ میں پیسے آنے لگیں (خصوصاً وہ جو اُس کی اپنی ذاتی آمدنی ہوں) تو سجنے، سنورنے اور بننے کی اس کی خواہش کچھ اور ہی سِوا ہو جاتی ہے۔ عورت کی فطرت کا یہ ایک لازمی وصف ہے۔

یوں ایک سادہ، معصوم اور شرم و حیا کا پیکرِ وجود غیر محسوس طور پر چمکتی، جھلملاتی اور پُرکشش صنفی دعوت کے روپ میں ڈھلنے لگا۔ باہر کی دُنیا اب اسے بہت بھانے لگی، اپنا آپ اسے اب بہت سہانا لگنے لگا!

(۷) مشینوں اور دفتروں میں مَرد کارکنوں کے ساتھ آٹھ آٹھ، دس دس گھنٹوں تک ایک ساتھ کام کرتے ہوئے دونوں کے درمیان شیطان نے از خود داخلہ بنا لیا۔ کہیں مَرد اور عورت کا ہاتھ آپس میں ٹکرا گیا، کہیں جسم سے جسم باہم مس ہو گئے، کہیں نگاہیں چپکے چپکے ایک دوسرے کے سراپے کا جائزہ لینے لگیں، اور کہیں تخلیے میں کھڑے دو چار جملے ایک دوسرے کے ساتھ ادا ہو گئے۔ صبح شام کے مصافحے تو بہر حال ان سب کے درمیان ایک طے شدہ بات تھی۔ جھجک اور شرم اب آہستہ آہستہ دونوں سے، مَردوں سے عموماً اور عورتوں سے خصوصاً، رخصت ہونے لگے۔

(۸) میز پر سامنے یا مشین کے پاس جوان و حسین صنفِ نازک موجود ہو اور مَرد اُس کی تعریفیں نہ کرے! مَرد کی ہمدردانہ نگاہ اور حوصلہ آور جملوں سے پھر عورت کے دل میں بھی یہ خیال جاگزیں ہونے لگا کہ فلاں مَرد دوسرے مَرد ساتھیوں کی نسبت اُس پر زیادہ مہربان ہے، خلوص بھی اس کے اندر دوسروں سے زیادہ ہی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یوں ''خدا کے بیٹے مسیح'' کی جگہ ''محبّت کے دیوتا کیوپڈ'' نے جگہ بنالی اور آرام سے آ کر دلوں کے اندر بیٹھ گیا۔ محبّت کی آگ تیز ہونے لگی۔ کبھی لڑکا اور لڑکی باہر گھومنے لگے اور کبھی ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلفانہ آنے جانے لگے۔

(۹) صنعتی مالکان کو اندازہ ہوا کہ ملازمت کی ضرورت کے باعث صنفِ نازک کی شکل میں انہیں ایک اچھا شکار ہاتھ آ گیا ہے۔ پتہ تھا کہ لڑکیاں معاشی طور پر مجبور ہیں اور وہ چاہیں تو انہیں مزید مجبور بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا جبری جسمانی استحصال بھی جاری ہو گیا۔ دوسری طرف بعض جری مگر نادان لڑکیوں نے مالکان کی زیادہ سے زیادہ توجّہ حاصل کرنے اور ان سے ملازمت

کے بیش از بیش فوائد سمیٹنے کی خاطر، خود بھی اپنے آپ کو اُن کی جانب زیادہ راغب کرنا شروع کر دیا۔ صورتِ حال پھر یہ بن گئی کہ صنعتی مالکان کی جانب سے یہ خاموش پیغام مسلسل ارسال کیا جا رہا تھا کہ یا تو ہمارے راستے پر چلو یا پھر ملازمت سے دستبردار ہو جاؤ۔ خاتون سوچنے لگی کہ وہ ملازمت چھوڑے تو کیسے چھوڑے! اور چھوڑ دے تو کہاں جائے؟ کیونکہ دوسرے کارخانے کا مالک بھی تو بالکل ایسا ہی ثابت ہوگا۔

(۱۰) ادھر مفاد پرستوں نے عورت کے حسن، اُس کی اداؤں، اور اُس کی قیمت کی بنا پر اُسے مزید پھانسنے کی کوشش کی اور تعمیری کاموں سے ہٹا کر اسے تفریحی مشغلوں میں الجھا دیا۔ نعرہ لگایا گیا کہ عوام کو پُرمشقّت ملازمت کے ساتھ ''ذہنی سکون'' بھی فراہم کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اس کی خاطر انہوں نے شہروں میں جگہ جگہ نائٹ کلب اور سینما گھر کھولنے شروع کیے جن میں نوجوان عورتوں کو حیا باختہ اداکاری، نیم عریاں رقص اور شہوت بھرے گیتوں کی ادائیگی میں مصروف کر دیا۔ عورت کے لیے یہ ایک بہت پُرکشش مصروفیت ثابت ہوئی، کیونکہ اس سے نہ صرف یہ کہ اُسے بھاری رقم مل رہی تھی بلکہ اُس کے چرچے بھی دُور دُور تک پھیل رہے تھے۔ پیشہ تھا ہی ایسا کہ اس میں اسے اپنے کپڑوں کو مختصر سے مختصر کرنا اور میک اپ زیادہ سے زیادہ کر کے حسین ترین نظر آنا تھا۔ اگر وہ یہ اطوار اختیار نہ کرتی تو اُس کی مارکیٹ ویلیو صفر ہوتی۔ اس کے بدلے کوئی اور دوشیزہ جگہ بنا لیتی!

(۱۱) اس مصروفیت نے عورتوں کو گویا پھر ان راستوں پر ڈال دیا جہاں شرم و حیا اور عفت و عصمت اُن کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں رہی۔ ذرائع ابلاغ میں زیادہ سے زیادہ داخل رہے جانے اور دولت کے ڈھیر پر ڈھیر جمع کرنے کی خاطر ان کے پاس قدرتی راستہ بچا ہی یہ تھا کہ وہ ''آزاد سے آزاد تر'' ہوتی چلی جائیں اور شرم و حیا کی زیادہ فکر نہ کریں۔ چنانچہ ان میں سے ایک بڑی تعداد نے اس مقصد کے لیے از خود ''کالے دھندوں'' کی راہ اپنائی جن کو سب سے زیادہ فروغ یہودی قوم نے دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر قسم کے کالے دھندوں کا کاروبار ان کے مزاج کو ہمیشہ سے راس آتا رہا ہے۔ امریکہ میں انہوں نے ''ہالی ووڈ'' کے نام سے پہلا فلمی اسٹوڈیو کیا کھولا کہ اس کے بعد تو پھر جیسے فضا میں ایک دوڑ سی لگ گئی۔ نگارخانوں کی چُندھیا دینے والی چکاچوند دیکھ کر وہ معصوم سی کم عمر لڑکی جو پہلے کبھی گھر ہی میں رہنے کو ترجیح دیتی تھی، شرم و حیا سے جھجکی سی رہتی تھی، کچھ ذاتی خواہش اور کچھ ترغیب و ترہیب کے باعث فلمی دُنیا کی رنگینیوں میں اس طرح ڈوب گئی

کہ اُسے اپنے نفع نقصان کا کچھ ہوش نہ رہا' بلکہ مذہب' اخلاق اور والدین' سب کو اُس نے ایک ساتھ الوداع کہہ دیا۔

(۱۲) کارخانے اور صنعتی ادارے پھلنے پھولنے لگے تو مصنوعات کے فروغ کے لیے مالکان کو اشتہارات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عورت تو اس کام کے لیے پھر سب سے زیادہ مناسب ''شے'' سمجھی گئی۔ جو چیز کسی وجہ سے نہ بِک سکے' وہ عورت کے حسن کے باعث تو ضرور ہی کوئی قدر و قیمت بنا لے گی۔ چنانچہ انہوں نے عورت کا استعمال اس طرح بھی شروع کر دیا۔ یوں عورت ایک نئی راہ —— ماڈل گرل کے کاروبار —— پر بھی چل پڑی۔ مَردوں کے مختلف عیارانہ اور ''واعظانہ'' پھندوں کے باعث وہ جب اس دلدل میں مسلسل پھنستی چلی گئی تو دام لگانے والوں نے ادھیڑ عمر عورتوں کی جگہ نوجوان و پُرکشش لڑکیوں کو مقام دینا شروع کر دیا۔ (سیکریٹری کی سیٹ کے لیے آج بھی اشتہاروں میں صاف مطالبہ کیا جاتا ہے کہ صرف وہی خواتین درخواست دیں جو ''نوجوان'' ہوں اور ''پُرکشش'' ہوں۔)

(۱۳) ماڈل گرلز جس قدر بے باک اور اچھے نقش و نگار کی حامل ہوتیں' اسی قدر وہ زیادہ معاوضہ پاتیں۔ لیکن کام کے اوقات میں وہ بس محض آجر کی غلام ہی رہتیں۔ آجر ان سے جس طرح کا چاہتا' کام لیتا۔ لٹاتا' جھلاتا' تیراتا' درختوں پر لٹکواتا' بارشوں میں نہلواتا' اور جیسے چاہتا جملے ادا کرواتا وغیرہ۔ یہ اوقات بس صرف آجر کے تھے اور ماڈل گرل اُس کی ایک کٹھ پتلی تھی۔

(۱۴) پھر یہ نعرہ بھی عطا کیا گیا کہ جسمانی لطف کا حصول عورت کا فطری حق ہے' جس مقصد کے لیے وہ کسی کے ساتھ بھی دوستی کر سکتی اور ''ڈیٹ'' لے سکتی ہے۔ عورت کو یہ بھی جتایا گیا کہ اُدھر مَرد کا بھی حق ہے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرے۔ اس لیے ''کسی کو بھی کسی کے ساتھ'' انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ''ہر مَرد ہر عورت کے لیے' اور ہر عورت ہر مَرد کے لیے''۔ باور کرایا گیا کہ اخلاق' تہذیب اور مذہب سب کچھ ڈھکوسلا ہیں اور عورت کو قید رکھنے کا محض ایک ''مولویانہ'' و ''پادریانہ'' بہانہ ہیں!

(۱۵) عورت کی مصروفیت جب ہر میدان میں بڑھتی چلی گئی تو اس کے سامنے سوال اب بچوں کے پالنے اور پرورش کرنے کا آیا۔ بچوں کی پرورش کے لیے تو خاصے وقت' محنت' اور ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ملازمت اور دیگر مصروفیات کے باعث عورت کے پاس وقت کہاں تھا؟

شام کو نگار خانوں اور ملازمتوں سے واپسی کے بعد وہ تھک کے چُور اور چڑچڑی ہو جاتی۔ ایک طرف گھر کے بقایا کام اور دوسری طرف اُس کے بال بچے! سوچنے لگی کہ یہ بھی کوئی آزادی ہے کہ گھر واپسی کے بعد دوسری ''ملازمتیں'' بھی اُس کے انتظار میں رہیں! اصلی ملازمت تو وہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی' کیونکہ بہت سارے مسائل کا حل وہی ملازمت تھی۔ چنانچہ اب ملازمت کی جگہ اُس نے خود بچوں ہی سے جان چھڑانے کی سوچ اپنائی۔ پہلے تو اس سلسلے میں اس کے لیے ''بے بی ڈے کیئر مراکز'' کھولے گئے۔ لیکن مسائل کا مکمل حل تو یہ بھی ہرگز نہ تھا۔ چنانچہ اب درمیان میں ایک یہودی دانشور مالتھس مدد کو آیا۔ مستقبل میں آبادی کے زیادہ اور خوراک کے کم ہو جانے کا ''ہوا'' پیش کر کے اُس نے آبادی کو کم کرنے کی ایک دوسری مضبوط عالمی مہم چلائی۔ زور دیا کہ ''انسانی پیداوار کم کرنے اور کنبے مختصر کرنے کی ضرورت لازمی ہے''۔ مقصد اس ساری عیارانہ مہم کا یہ تھا کہ مَرد و عورت دونوں اپنی اپنی ذہنی' جسمانی اور مالی عیاشی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ کریں۔ مالتھس نے دُنیا بھر کو یہ مضبوط و خوب صورت نعرہ دے کر کہ ''بچے کو قربان کر دو' عیاشی کو قربان نہ کرو'' گویا ایک احسان سے نواز دیا۔

موجودہ آزادانہ صورتِ حال میں ہر سال نئے بچے کی آمد سے عورت بہرحال دل برداشتہ بھی ہوتی جا رہی تھی۔ ''آبادی گھٹاؤ اور کنبہ مختصر کرو'' کے اس دلفریب نعرے نے اُس کے دل کو تو جیسے موہ لیا اور وہ اولاد کو تج دینے جیسے اقدام پر خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ اولاد جو کسی شادی شدہ عورت کے لیے ہمیشہ سے سرمستی و خود اعتمادی کا ذریعہ بنتی رہی ہے' اُس دور کی جدید عورت کو وہی سراسر بوجھ لگنے لگی۔

(۱۶) ناجائز تعلقات کے نتیجے میں جنم لینے والی متوقع اولاد کے خطرے سے بچے رہنے کی خاطر اب ضرورت لاحق ہوئی کہ اس کے لیے مانعِ حمل ادویات و آلات بھی سامنے لائے جائیں تاکہ دوطرفہ عیاشیوں میں کسی قسم کی بھی جھجک اور رکاوٹ باقی نہ رہے۔ ''ہر معاملہ کامل بے فکری سے!'' مفکّرین کے مطابق مَرد و عورت میں سے کسی کو بھی' عورت کو تو خصوصاً' اولاد کا خوف ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح تحدیدِ اولاد کے بھی سامان مکمل ہو گئے۔ اولاد کا خوف ذہنوں سے نکل گیا تو شعوری طور پر خواتین کو احساس ہوا کہ اب جا کر کہیں ان کی آزادی مکمل ہوئی ہے۔

(۱۷) عورت چونکہ اب زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہوتی جا رہی تھی' نیز دانشور اور ادیب اُس کی پیٹھ

ٹھونکنے کو ہر گھڑی پیچھے کھڑے بھی رہا کرتے تھے‘ اس لیے دونوں طرف سے اب یہ نیا نعرہ لگایا گیا کہ حکومتی و سیاسی ایوانوں کو بھی عورتوں سے پُر ہونا چاہیے اور وہاں ان کا حصّہ بھی مَردوں کی مانند ہی مقرر ہونا چاہیے۔ ’’سیاست صرف مَرد کریں اور حکومت بھی وہی چلائیں‘‘ یہ کوئی انصاف نہ ہوا! ’’ہم خواتین عقل میں ان سے کوئی کم تھوڑی ہیں!‘‘ مطالبہ کرتے اور تحریک چلاتے چلاتے حکومتوں کو بھی بالآخر اُن کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ یوں وہ دفتروں‘ کارخانوں‘ تعلیمی اداروں‘ نائٹ کلبوں‘ فلمی میدانوں‘ اور کھیل کود کے میدانوں سے ہوتی ہوئی سیاست کے کارزاروں میں بھی داخل ہوگئیں۔

(۱۸) اپنی آزادی کے لیے مغربی خواتین نے طویل جِدّوجُہد کی تھی‘ بے حد و حساب صعوبتیں برداشت کی تھیں‘ مظاہرے منظم کیے تھے‘ قید و بند کی سزائیں بھگتی تھیں‘ سنگ باریاں کی تھیں‘ اور کلیساؤں اور حکمرانوں کی مشترکہ نفرتوں کو سہا تھا‘ لیکن ہمت نہیں ہاری تھی‘ کیونکہ ان کے پیچھے یہودی دانشوروں‘ ادیبوں نیز شاعروں کی اکساہٹ اور حوصلہ افزائی شامل تھی۔ چنانچہ مقصد کے حصول کے ہر ہر مرحلے کے بعد وہ ’’هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ!‘‘ کا نعرہ لگاتی چلی گئیں۔

آخر کار ڈیڑھ دو سو سال کی مطلوبہ‘ بلکہ اس سے بھی زائد آزادی کے حصول سے لطف اندوز ہونے کے بعد پھر جا کر انہیں کہیں خیال آیا کہ اب ذرا ایک جائزہ کچھ اپنے نفع نقصان کا بھی لے لینا چاہیے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی جا کر انہیں کہیں محسوس ہوا کہ بظاہر تو وہ جنگ جیت چکی ہیں‘ لیکن جیتی ہوئی اس جنگ میں وہ دراصل ہاری زیادہ ہیں۔ ذمے داریاں اُن پر دوہری آن پڑی ہیں‘ گھر اُن کے برباد ہو گئے ہیں‘ اپنا سچا خیر خواہ بھی کوئی نہیں رہا ہے‘ مادرانہ گودیں بھی ایک زمانے سے معصوم بچوں کو ترس رہی ہیں‘ وہ صرف پیسے کمانے اور لوگوں کا دل لبھانے کی مشینیں بن کے رہ گئی ہیں‘ معاشرہ اب بھی انہیں کسی بڑی ذمے داری دینے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہے‘ اور ان کی غیر بارآوری کے نتیجے میں قوم کی افرادی قوت بھی مسلسل گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ اب جا کر انہیں صحیح اندازہ ہوا کہ یہ تو سب کچھ غلط ہو گیا! چکہ اُلٹا گھوم گیا ہے۔ اس لیے دہائی دی کہ ع ’’مژگاں تو کھول‘ شہر کو سیلاب لے گیا!‘‘ اور یہ کہ ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا‘ جو سنا افسانہ تھا!

اب ان کے ہاں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ ان کے اہم مفکّر مَرد و خواتین چیخنے لگے کہ اس طرح تو حریف مسلم تہذیب ان پر حاوی ہو جائے گی اور اپنے ہی شہر میں وہ اقلیت میں

تبدیل ہو جائیں گے!

چنانچہ اب وہاں ’’واپس گھر کو چلو‘‘ اور ’’آبادی میں اضافہ کرو‘‘ جیسی مہمیں دوبارہ اٹھنی شروع ہو گئیں۔ فرانس میں بھی ایک کمزور سی تحریک حالیہ زمانے میں اسی طرح کی شروع ہوئی: ’’واپس گھر کو چلو۔‘‘ گویا لوٹ کر اب یہ عورتیں دوبارہ اپنے گھروں کو رونق بخشنا چاہ رہی ہیں۔

یہ وہ مرحلہ وار تفصیل تھی جن سے گزر کر مغربی خواتین اس موجودہ دور تک پہنچی ہیں۔ خود تو انہوں نے اپنے آپ کو برباد کیا ہی‘ دُنیا بھر کی خواتین کو بھی جہنّم کی آگ میں جھونک دیا۔

جامعیت کے ساتھ اب یہ کہنا بہت درست ہے کہ خواتین کے حقوق کے بارے میں کچھ بھی کہا جائے‘ کچھ بھی اقدام کیے جائیں‘ کتنی ہی کتابیں لکھ لی جائیں‘ اور کتنی ہی کانفرنسیں برپا کر لی جائیں‘ بہر حال یہ طے ہے کہ تحریک آزادیٔ نسواں کا نتیجہ:

☆ سوائے بدکاری‘ گناہ اور شہوت پرستی کے کچھ اور نہیں نکلتا۔

☆ بہترین حقوق حاصل کرنے کے باوجود عورت بدترین مظالم کا شکار رہتی ہے۔

☆ اسے اپنے خاندان کی تباہی برداشت کرنی پڑتی ہے۔

☆ سوائے صنفی‘ استحصالی اور دلچسپ آلۂ کار کے وہ اور کسی صورت میں معاشرے کے سامنے نہیں آتی۔

☆ آخری عمر میں اپنی قیمتی صحت کو برباد کر کے وہ تنہائے محض بھی رہ جاتی ہے اور عموماً خودکشی کر لیتی ہے۔

علّامہ اقبال کے نظریات

علّامہ اقبال نے یورپ میں تعلیم حاصل کرنے اور بہت کچھ وقت گزارنے کے باعث اُس معاشرے کو اندر اور باہر سے بخوبی دیکھا اور پرکھا تھا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ یہ مغرب کی فضا تھی جس نے انہیں مسلمان بنایا ہے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث اُن کی دُور بین نگاہوں نے اسی دور میں بھانپ لیا تھا کہ جلد یا بدیر یہ مغربی تہذیب از خود فنا کے گھاٹ اتر جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے کہا تھا ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا‘ ناپائیدار ہو گا!

لندن اور جرمنی میں رہائش کے دوران انہوں نے قدرتی طور پر وہاں کی عورتوں کی آزادی اوران کے چال چلن کا بھی پوری طرح مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ دوسرے دانشوروں کے برعکس ان کے خیالات خواتین کے بارے میں بہت حقیقی ہو گئے تھے۔ متعدد مرتبہ انہوں نے مغربی خواتین اور اُن کی بڑھتی ہوئی آزادی کے خلاف برملا اظہارِ رائے کیا تھا۔ اُن کے نزدیک مغربی خواتین آزادی نہیں حاصل کر رہی ہیں بلکہ خود کشی کا راستہ اختیار کر رہی ہیں۔ اس تحریک کی ابتدا کے بارے میں انہوں نے تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ (یورپ میں) ''جنگ سے پہلے نہ یہ ذوقِ عریانی تھا (اور) نہ یہ حسن کے مقابلے۔ یہ (سب کچھ دراصل) جنگ کا نتیجہ ہیں۔ جنگ سے اگر ایک طرف صفاتِ عالیہ کو تحریک ہوتی ہے تو دوسری جانب ادنیٰ سے ادنیٰ' اور سفلی سے سفلی جذبات (بھی) ابھر آتے ہیں۔'' وہ فرماتے ہیں کہ ''یوں بھی قتل اور خوں ریزی کا نتیجہ اجتماعی لحاظ سے ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ قومیں بے دریغ ایک دوسرے پر ظلم وستم کرتی ہیں۔ انسان جب بے دردی اور سفاکی کے ہولناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے' تو سمجھتا ہے زندگی نام ہے محض غلبہ وتغلب کا۔ اس میں کوئی اخلاقی قانون کام نہیں کرتا۔ (اور) نہ دُنیا کسی اخلاقی نظام کے سہارے چل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ پر پابندیاں عائد کر دیں اور ایسے قوانین وضع کر دیے جن سے اخلاقِ عالیہ کی حفاظت ہوتی ہے۔'' (''اقبال کے حضور میں''۔ حصّہ اول۔ صفحہ ۱۶۸' نذیر نیازی' اقبال اکیڈمی' کراچی)

لندن کے دورے کے دوران انہوں نے وہاں کی مقامی خواتین کے ساتھ ایک اجتماع میں مغربی عورت کے بارے میں بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ ''افسوس اُس قوم پر جس کی عورتیں Excitement کی تلاش میں رہتی ہیں''۔ پھر انہوں نے وہاں موجود خواتین سے یہ گزارش بھی کی تھی کہ وہ (اپنی) آئندہ نسل کو دہریت اور مادیت کے چنگل سے بچائیں۔'' (سفرنامہ' اقبال۔ محمد حمزہ فاروقی۔ صفحہ ۵۵' ۵۱)

ایک اور موقع پر مسلم خواتین کے بارے میں انہوں نے یہ تجزیہ بھی کیا تھا کہ ''بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں مسلمان خواتین (بھی) اپنا دین کھو رہی ہیں۔'' (کتاب: اوراقِ گم گشتہ' رحیم بخش شاہین' صفحہ ۳۰۱۔ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ۔ لاہور)

علامہ کہنا چاہ رہے تھے کہ مسلمان کے ہاتھوں سے جب ان کی اصل بنیاد' دین' ہی رخصت

ہو جاتی ہے تو پھر دُنیا کی ہر برائی اسے خوشنما لگنے لگتی ہے' جیسا کہ دُنیا کا ماحول ہمیں اب تک بتاتا چلا آ رہا ہے۔ علامہ نے عورتوں کے بارے میں ایک بار یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ ''وہ عورت جو کمالِ حُسن کے باوصف پندارِ حُسن سے مطلق مبرا ہو' (یعنی حسن رکھنے کے باوجود ناز وغرورِ حسن سے مطلق بے نیاز ہو) میرے نزدیک وہ مخلوقاتِ ارضی میں دلکش ترین شے ہے۔'' (کتاب: عروجِ اقبال' پروفیسر ڈاکٹر افتخار صدیقی' صفحہ ۳۷۴۔ طباعت ۱۹۸۷۔ بزمِ اقبال لاہور)

اپنے انہی جذبات کی مزید وضاحت علّامہ نے ایک دوسرے شعر میں یوں کی ہے:۔

مَیں نے اے اقبال' یورپ میں اُسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی!

چونکہ ہندوستان کی عورتیں شرم وحیا کی پیکر اور اپنی آبرو کی محافظ ہوا کرتی ہیں (یہ بھی ہمارے قدیم دور کے اوصاف تھے جو بہر حال اب اتنے مثالی نہیں رہے ہیں)' اس لیے مغرب کی آبرو باختہ و بے باک عورتوں میں مجھے ان مشرقی خواتین جیسی کوئی کشش قطعی نظر نہیں آئی۔ ذیل کے مزید اشعار بھی علّامہ اقبال کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

اور ؎

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیّت کہ جو ہے خود لبِ گور!

اور ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت!

❁❁❁

علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۳)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

آپ کا اسم گرامی عبداللہ بن مسعود بن غافل اور کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے۔ آپ کا تعلق قبیلہ بنوہذیل سے تھا۔ والدہ کا نام اُمّ عبد اور وہ بھی اسی قبیلے سے تھیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کو والدہ کی جانب منسوب کر کے ابن اُمّ عبد بھی کہا جاتا ہے۔ آپ نے بہت پہلے اسلام قبول کیا' خود فرماتے ہیں کہ میں چھٹا مسلمان تھا' ہمارے سوا روئے زمین پر ساتواں مسلمان کوئی نہ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اوّلین شخص ہیں جنہوں نے جہراً قرآن مجید پڑھ کر قریشِ مکّہ کو سنایا اور مار کھائی۔ اسلام لانے کے بعد آپؓ کا زیادہ وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں گزرتا۔ وضو کے پانی کا انتظام کرتے اور مسواک مہیّا کرتے' چلنے پر جوتا پہناتے اور بیٹھنے پر اسے سنبھالتے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلتے تو حضرت ابن مسعودؓ آگے آگے چلتے۔ آپ غسل فرماتے تو یہ پردہ کرتے' جب آپؐ استراحت فرماتے تو یہ (وقت پر) جگاتے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا انہی کاموں کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر آنا جانا لگا رہتا۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اور میرا بھائی یمن سے مکّہ آئے' ہم نے کچھ عرصہ وہاں گزارا' دورانِ اقامت ہم عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی والدہ کو خاندانِ نبوّت میں سے تصوّر کرتے تھے' اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں ان دونوں کی آمدورفت بہت زیادہ تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پہلے حبشہ اور پھر مدینہ ہجرت کی اور قبلتین کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت میں غزواتِ بدر و اُحد و خندق' بیعتِ رضوان اور دیگر معرکوں میں شرکت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابنِ مسعودؓ معرکۂ یرموک میں شامل ہوئے۔ آپ کے جنّتی اور عالی مرتبت ہونے کی

نوٹ: اس سلسلۂ مضامین کی پہلی قسط شمارہ اپریل اور دوسری قسط شمارہ جولائی میں شائع ہو چکی ہے۔

شہادت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں کسی کو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر امیر بنانا چاہتا تو عبداللہ بن مسعودؓ کو بناتا۔ حضرت ابنِ مسعودؓ خلافتِ فاروقی اور عثمانی کے دوران کوفہ میں بیت المال کے خازن رہے۔ آخر عمر خلافتِ عثمانی میں مدینہ تشریف لائے اور ۳۲ھ میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ حسبِ وصیت جنّت البقیع میں دفن کیے گئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا علمی مقام

آپ صحابہ کرامؓ میں سے قرآن پاک کے سب سے بڑے حافظ تھے' خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ سے قرآن مجید سننا پسند تھا۔ حضرت ابن مسعودؓ خود روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے سورۃ النساء پڑھ کر سناؤ''۔ میں نے عرض کی کہ کیا میں آپ کو پڑھ کر سناؤں' حالانکہ قرآن آپ پر اُترا ہے! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں دوسروں سے قرآن سننا پسند کرتا ہوں''۔ چنانچہ میں نے تلاوت شروع کی' جب اس آیت پر پہنچا ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾ ''پس کیا کیفیت ہوگی جب ہم ہر اُمّت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو ان (لوگوں) پر گواہ بنا کر لائیں گے''۔ تو بے ساختہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مزید برآں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص چاہے کہ قرآن کی اس طرح تر و تازہ تلاوت کرے جیسے کہ وہ اُترا تھا' تو وہ ابن مسعود کی طرح تلاوت کرے۔ مسروقؒ تابعی کا قول ہے کہ اصحابِ رسول کا علم چھ صحابہ کی ذات پر ختم ہو گیا یعنی عمرؓ و علیؓ و اُبی بن کعبؓ و ابوالدرداءؓ و زید بن ثابتؓ و ابن مسعودؓ۔ پھر ان چھ صحابہ کا علم دو ہستیوں کی ذات میں مرکوز ہو کر رہ گیا یعنی علی و عبداللہ بن مسعود' رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ کسی ایسے شخص کا پتہ بتلایئے جس کے اخلاق و عادات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہوں اور ہم ان سے استفادہ کریں۔ آپؓ نے فرمایا کہ ہم صحابہ میں سے کسی کو نہیں جانتے جس کی چال ڈھال ابن مسعود سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتی جلتی ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابن مسعودؓ کو کوفہ کا قاضی اور معلّم بنا کر بھیجا تو اہلِ کوفہ کو لکھا کہ میں نے عبداللہ بن مسعودؓ کو تمہاری جانب بھیج کر تمہیں اپنی ذات پر ترجیح دی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ اہلِ کوفہ کو تفسیر' حدیث اور فقہ کا درس دیتے رہے۔ نص کی عدم موجودگی میں آپؓ اپنی

رائے پر عمل کرتے تھے' اس طرح آپ اصحاب الرائے کے مکتب فکر کے اوّلین مؤسّس قرار پائے۔
جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے آج تک ابن مسعودؓ جیسا خلیق' نرم مزاج' بہترین ہم نشیں اور ان سے بڑھ کر عابد و زاہد شخص نہیں دیکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ آیا تم خلوصِ دل سے یہ بات کہہ رہے ہو؟ لوگوں نے جواب دیا کہ جی ہاں! آپؓ نے فرمایا کہ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میری رائے بھی یہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ درج بالا بیانات سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اصحابِ رسولؐ میں کیا مقام و مرتبہ حاصل تھا۔

تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مرتبہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے جب کوئی قرآن کی دس آیات سیکھ لیتا تو جب تک ان کا معنی و مفہوم اور ان پر عمل کرنا نہ سیکھ لیتا' آگے نہ بڑھتا۔ مشہور تابعی مسروق کا قول ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ اُس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! قرآن پاک کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کب اور کہاں نازل ہوئی' اور اگر مجھے کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ تفسیر قرآن مجھ سے بہتر جانتا ہے اور سواری وہاں پہنچ سکتی ہے تو مَیں اُس کے ہاں حاضری دے کر استفادہ کروں۔ اسی طرح مسروق کا کہنا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ ہمیں ایک سورت پڑھ کر سناتے اور (وقت کا) اکثر حصّہ اس کی تفسیر بیان کرنے میں صرف کر دیتے۔ ابونعیم ''الحلیۃ'' میں روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ابن مسعودؓ کے بارے میں کچھ بتلایئے؟ آپؓ نے فرمایا کہ ابن مسعودؓ نے کتاب و سنّت کا علم حاصل کیا اور پھر اسی پر اکتفا فرمایا۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میرے علم کی حد تک ابن مسعودؓ سے بڑھ کر قرآن کا کوئی عالم نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سن کر ستّر سورتیں یاد کیں۔ ایک دوسرے موقع پر آپ کا ارشاد ہے کہ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے ہیں کہ مَیں ان سب سے بڑھ کر قرآن مجید کا علم رکھتا ہوں مگر ان سے افضل نہیں ہوں۔ اگر مجھے پتہ چلے کہ کوئی شخص مجھ سے بڑھ کر قرآن کا عالم ہے اور اونٹ وہاں پہنچ سکتے ہیں' تو مَیں اُس کے ہاں ضرور حاضری دوں (اور علم حاصل کروں)۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وفات کے بعد فرمایا کہ ابن مسعودؓ

نے اپنے پیچھے اپنے جیسا کوئی عالم نہیں چھوڑا۔ مشہور تابعی عبدالرحمٰن سلمیؒ کا قول ہے کہ (صحابہ کرامؓ میں سے) جو حضرات قرآن پاک کی تعلیم دیا کرتے تھے' مثلاً عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ' انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دس آیتیں سیکھتے تو اُن سے اُس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک کہ ان آیات کی تمام علمی و عملی باتوں کا علم حاصل نہ کر لیتے۔ المختصر حضرت ابن مسعودؓ کتاب اللہ کے معانی و مطالب' محکم و متشابہ' حلال و حرام' قصص و امثال اور اسبابِ نزول کے عظیم ترین عالم' محدّث اور فقیہہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بعد سب سے زیادہ تفسیری اقوال حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ہیں۔ امام سیوطی ''الاتقان'' میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت حضرت ابن مسعودؓ سے زیادہ تفسیری روایات مروی ہیں۔ چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زیادہ رہائش کوفہ رہی' اسی بنا پر اہلِ کوفہ آپ کے چشمہ علم و فیض سے زیادہ سیراب ہوئے۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں مسروق بن اجدع' علقمہ بن قیس نخعی' اسود بن یزید' ابومعمر' ابووائل اور دیگر علمائے کوفہ رحمہم اللہ شامل ہیں۔ کتبِ تفسیر و حدیث میں بکثرت اسانید حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ ان مختلف اقسام کی اسانید کو نقادوں نے خوب جانچا پرکھا تو درج ذیل طرق حتمی طور پر پایۂ صحت تک پہنچے:

(ا) بسند اعمش از ابوالضحیٰ از مسروق از ابن مسعودؓ' یہ صحیح ترین سند ہے اور امام بخاریؒ نے اپنی 'صحیح' میں اسی پر اعتماد کیا ہے۔

(ب) از طریق مجاہد از ابومعمر از ابن مسعودؓ' یہ بھی صحیح سند ہے اور اس کو امام بخاریؒ نے اپنی 'صحیح' میں روایت کیا ہے۔

(ج) بسند اعمش از ابووائل از ابن مسعودؓ' یہ سند بھی ضعف سے پاک ہے اور امام بخاریؒ اس کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

(۳) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

آپ کا اسم گرامی علی بن ابی طالب اور کنیت ابوالحسن ہے' قبیلہ بنو ہاشم سے تعلق ہے۔ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی اور آپؐ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل حضرت فاطمہؓ سے ہی چلی۔ حضرت علی کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ آپ خلفائے راشدین میں سے چہارم اور بنو ہاشم میں اولین خلیفہ تھے۔ نوجوانوں میں سب سے پہلے

آپ ہی مشرف باسلام ہوئے۔ تبوک کے سوا تمام غزوات میں حضرت علی ؓ نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضور ﷺ آپ کو مسلمانوں کے اہل وعیال کی حفاظت کے لیے مدینہ چھوڑ گئے تھے۔ متعدد غزوات میں حضور ﷺ نے آپ کو عَلَم عطا فرمایا۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں ایسے شخص کو عَلَم عطا کروں گا جس کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے گا' وہ شخص اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبّت کرتا ہے اور اللہ اور اُس کا رسولؐ اُس سے محبّت کرتے ہیں۔ پھر حضور ﷺ نے جھنڈا حضرت علی ؓ کو عطا فرمایا اور آپ کے ہاتھوں فتح حاصل ہوئی۔ جب حضورِ اقدس ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے بعد رشتۂ مواخات استوار فرمایا تو حضرت علی ؓ کو اپنا بھائی قرار دیا اور فرمایا کہ تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔ حضرت علی ؓ مناقب وفضائل کے جامع اور عشرۂ مبشرہ میں شامل ہیں۔ آپ اپنی خلافت کے دوران کوفہ میں ماہِ رمضان ۴۰ھ میں ابن ملجم خارجی کے ہاتھوں دورانِ نماز رتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے' اُس وقت آپ کی عمر ۶۳ برس تھی۔

حضرت علیؓ کا علمی اور تفسیری مقام

آپؓ علم کے بحرِ زخار تھے۔ زورِ بیاں' قوتِ استنباط' فصاحت و بلاغت' حکمت وخطابت اور شعر میں عدیم المثل تھے۔ حضرت علی ؓ فیصلہ کن عقل کے مالک اور گہری' دُوررس نگاہ رکھنے والے تھے۔ مشکل مسائل کے حل میں صحابہ کرام ؓ اکثر آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے جب آپ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو یوں دعا فرمائی کہ اے اللہ! اس کی زبان کو استقامت اور دل کو ہدایت عطا فرما۔ آپ کی قوتِ فیصلہ ضرب المثل کی حد تک مشہور تھی۔ حضرت عمر ؓ کی مشاورتی مجلس میں حضرت علی ؓ کو اہم مقام حاصل تھا۔ ایک بار کوئی مشکل مسئلہ درپیش تھا جب کہ حضرت علی ؓ مجلس میں موجود نہیں تھے۔ اس پر حضرت عمر ؓ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا: ''قضیة ولا اباحسن لها'' (پیچیدہ معاملہ ہے اور ابوالحسن (حضرت علی) موجود نہیں)۔ یہ جملہ ایسا مشہور ہوا کہ عرب میں ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا۔ ان تمام اوصاف میں زیادہ حیرت کی بھی بات نہیں' کیونکہ حضرت علی ؓ گھرانۂ نبوت میں پلے بڑھے' علوم ومعارف ان کی گھٹی میں اور سینہ حضور ﷺ کی برکت سے مخزن العلوم تھا۔ علقمہؒ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ہم (صحابہ) کہا کرتے تھے کہ مدینہ کے سب سے بڑے قاضی حضرت علی ؓ

ہیں۔ عطاء سے دریافت کیا گیا کہ آنحضرت کے صحابہ میں حضرت علی ؓ سے بڑھ کر بھی کوئی عالم تھا؟ جواب ملا کہ خدا کی قسم! مجھے کوئی ایسا شخص معلوم نہیں جو اُن سے بڑھ کر عالم ہو۔ سعید بن جبیرؒ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت علی ؓ سے کوئی بات ثابت ہو جاتی (پایۂ تحقیق تک پہنچ جاتی) تو ہم کسی دوسرے کی جانب رجوع نہ کرتے۔ حضرت ابن عباس ؓ کہا کرتے تھے کہ میں نے تفسیر قرآن کے متعلق جو کچھ بھی سیکھا' حضرت علی ؓ سے سیکھا۔

الحلیۃ میں ابونعیم حضرت علی ؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ بخدا! مجھے ہر آیت کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کس حوالے سے اور کہاں اُتری' مجھے اللہ نے دماغِ روشن اور زبانِ گویا بخشی ہے۔ ابوالطفیل کا کہنا ہے کہ میں نے بذاتِ خود سنا کہ حضرت علی ؓ خطبہ میں فرما رہے تھے: ''جو پوچھنا چاہو پوچھ لو' خدا کی قسم! تم جو بات بھی پوچھو گے مَیں اُسی کے بارے میں تمہیں بتاؤں گا' مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں دریافت کر لو' بخدا کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے علم نہ ہو کہ وہ دن کو اُتری یا رات کو' میدان میں اُتری یا پہاڑ پر''۔ البتہ یہ حقیقت محتاجِ بیاں نہیں کہ حضرت علی ؓ سے جو تفسیری اقوال منقول ہیں ان میں اقوالِ صحیحہ کی نسبت موضوع روایات زیادہ ہیں' اس کی بڑی وجہ غالی شیعوں کا حُبِّ علی کے زعم میں یہ اقوال گھڑ کر ان کی طرف منسوب کر دینا ہے' حالانکہ حضرت علی ؓ کا دامن اس سے بالکل پاک ہے۔ یہ اقوال یا تو اپنے عقیدہ کی تشہیر واشاعت اور استحکام کے لیے وضع کیے گئے' یا اس ظن فاسد کی بنا پر کہ جس قدر علمی اقوال کو حضرت علی ؓ کی طرف منسوب کیا جائے گا' اس سے ان کی شان مزید بڑھے گی۔ حق بات تو یہ ہے کہ کثرتِ وضع نے حضرت علی ؓ کے علم وفضل کے کثیر حصے کو رائیگاں کر دیا۔ حضرت علی ؓ سے اخذ وروایت کے اصح طرق درج ذیل ہیں:

(ا) از ہشام از محمد بن سیرین از عبیدہ سلمانی از (حضرت) علی ؓ۔ امام بخاریؒ اسی سند سے روایت کرتے ہیں۔

(ب) از ابن الحسین از ابوالطفیل از (حضرت) علی ؓ۔ یہ سند بھی صحیح ہے، محدث ابن عیینہ اپنی تفسیر میں اسی سند سے روایت کرتے ہیں۔

(ج) بطریق زہری از علی زین العابدین از (حضرت) حسین ؓ از (حضرت) علی ؓ۔ بعض محدثین نے اسے اصح الاسانید قرار دیا ہے' لیکن یہ سند پہلی دونوں اسانید کی طرح مشہور نہیں ہوئی' وجہ یہ ہے کہ کذّاب راویوں نے بہت سی جھوٹی روایات حضرت زین العابدین کی طرف منسوب کر دیں' جس سے یہ سند کامل اعتماد کھو بیٹھی۔

(۴) حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ

آپ کا اسم گرامی ابی بن کعب بن قیس انصاری خزرجی تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کی کنیت ابوالمنذر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوالطفیل رکھی۔ آپ نے بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر میں شرکت کی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو حضرت اُبیؓ نے آپؐ کے اوّلین کاتب ہونے کا مقام حاصل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کہ اُبی مسلمانوں کے سردار ہیں۔ آپ کی وفات کے بارے میں علماء مختلف الرائے ہیں۔ اکثریت کے بقول حضرت اُبی بن کعبؓ نے خلافتِ فاروقی میں سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔

حضرت اُبی بن کعبؓ کا علمی اور تفسیری مقام

آپ سیّد القُرّاء تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا: وَأَقْرَءُهُمْ أُبَيُّ بْنُ كَعْب ''اوران (صحابہؓ) میں سب سے بڑے قاری اُبی بن کعب ہیں''۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو قرآن مجید سنایا کرتے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اُبیؓ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کو سورۂ 'لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا' پڑھ کر سناؤں۔ حضرت اُبی نے عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر فرمایا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! یہ سن کر حضرت اُبی (خوشی سے) رونے لگے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت اُبی سے کہا گیا کہ کیا آپ اس پر خوش ہو گئے تھے؟ حضرت اُبی نے کہا کہ میرے لیے خوشی سے کون سی چیز مانع تھی۔ قرآن تو خود کہتا ہے: ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸﴾ (یونس) ''آپ کہہ دیجیے کہ بس لوگوں کو اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے' وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔''

حضرت اُبیؓ بن کعب کا شمار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کتاب اللہ کے سب سے بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے سے قبل آپ یہود کے علمائے کبار میں سے تھے۔ اسلام لانے کے بعد علومِ قرآنی سے آپ کی گہری وابستگی رہی۔ اسی بنا پر حضرت اُبی کا شمار مشہور مفسّرین صحابہؓ میں ہوتا ہے اور آپ کے تفسیری اقوال کو وقعت و اعتماد کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ کی عظمت کا

اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی آپ سے استفادہ کرنے والوں میں شامل ہیں۔ معمرؒ کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیشتر علوم تین حضرات سے ماخوذ ہیں' عمرؓ' علیؓ اور اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اُبی بن کعبؓ پہلے مفسر ہیں کہ جن کی تفسیر کتابی صورت میں مرتّب ہوئی۔ آپ کے تفسیری اقوال کی درج ذیل مشہور اور صحیح اسانید ہیں:

(ا) بسند ابوجعفر رازی از ربیع بن انس از ابوالعالیہ از ابیؓ بن کعب۔ حضرت اُبی کی تفسیر کا ایک بڑا نسخہ تھا جو اس سند سے علماء تک پہنچا۔ امام ابن جریرؒ' ابن ابی حاتمؒ' احمد بن حنبل اور حاکم رحمہم اللہ نے اس نسخہ سے روایات لی ہیں۔ امام حاکم کی وفات ۴۰۵ھ میں ہوئی' اس لیے 'الاتقان' کے مطابق یہ نسخہ تفسیر پانچویں صدی تک موجود تھا۔

(ب) بطریق وکیع از سفیان از عبداللہ بن محمد بن عقیل از طفیل بن اُبی بن کعب۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں اسی سند سے روایت کی ہے' یہ سند حسن کے درجہ کی ہے' حافظ ہیثمیؒ نے بھی مجمع الزوائد میں اس سند کو حسن کہا ہے۔

(۵) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

آپؓ زید بن ثابت بن ضحاک ہیں' کنیت ابوسعید بھی ہے اور ابوخارجہ بھی۔ حِبرُ الاُمّۃ' کاتب الوحی' مُقری (قرآن کریم کی قراءت کرنے والے یا علم قراءت پر عبور رکھنے والے) ان کے القاب ہیں۔ آپ کا انصار کے قبیلۂ خزرج کی شاخ بنونجار سے تعلق تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو ان کی عمر گیارہ برس تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ کہہ کر ان کا تعارف کرایا گیا کہ بنونجار سے تعلق ہے اور سترہ سورتیں پڑھ چکے ہیں۔ یہ سن کر نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت خوش ہوئے اور قرآن پڑھنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ حضرت زیدؓ نے جب سترہ سورتیں سنائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسرت کا اظہار فرمایا اور دعائے خیر دی۔ غزوۂ بدر میں کم عمر ہونے کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو شرکت کی اجازت نہ دی۔ غزوۂ اُحد میں آپ کی شرکت کے بارے میں اختلاف ہے۔ غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے ساتھ آپ خندق سے مٹّی نکال کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تھے' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محبّت سے فرمایا کہ کیسا اچھا لڑکا ہے۔ غزوۂ تبوک میں ان کے قبیلے بنو مالک بن نجار کا علَم حضرت عمارہ بن حزمؓ کے پاس تھا۔

حضور ﷺ نے ان سے عَلَم لے کر حضرت زید بن ثابت کے حوالے کر دیا۔ اس پر حضرت عمارہؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! کیا میرے بارے میں کوئی ناپسندیدہ بات آپ کے علم میں آئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسی کوئی بات نہیں، مَیں نے زید کو عَلَم صرف اس لیے دیا ہے کہ وہ تم سے زیادہ قرآن پڑھ چکے ہیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ کاتب وحی بھی تھے، مدینہ منورہ میں زیادہ تر آپ ہی کتابت کیا کرتے تھے۔ اہلِ سیر کا بیان ہے کہ حضرت زید نہ صرف عربی میں پڑھ لکھ لیتے تھے بلکہ انہوں نے حضور ﷺ کے ایما پر عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھ کر ان میں بھی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت بہم پہنچالی تھی۔ حضورِ اقدس ﷺ کی طرف سے جو مختلف خطوط کے جوابات بھیجے جاتے، وہ بھی حضرت زید ہی لکھا کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہدِ خلافت میں آپ مجلس شوریٰ کے رکن رہے اور مراسلت کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد رہی۔ حضرت عمرؓ نے دو مرتبہ حج کے موقع پر اور ایک مرتبہ شام کے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے آپ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں آپ مدینہ کے قاضی بھی رہے۔ حضرت عثمانؓ بھی جب حج پر جاتے تو حضرت زید بن ثابتؓ کو اپنا قائم مقام مقرر فرماتے۔ آپ کے عہد میں حضرت زید بیت المال کے ناظم بھی رہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کو ۴۵ھ (بروایت دیگر ۴۶ھ) میں خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وفات کی خبر پھیلی تو لوگ غم واندوہ سے نڈھال ہو گئے۔ والیٔ مدینہ مروان بن الحکم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ شاعرِ رسول حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ اُس وقت حیات تھے، انہوں نے آپ کا مرثیہ کہا۔ اسی کا ایک مصرعہ ہے: ومَن للمعانی بعد زید بن ثابت (اور زید بن ثابتؓ کے بعد معنی فہمی ختم ہوگئی)۔ حضرت ابوہریرۃؓ کو حضرت زیدؓ کے انتقال کا پتہ چلا تو بے اختیار پکار اُٹھے کہ آج حبر الامۃ اُٹھ گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جنازے اور تدفین میں شریک تھے۔ جب حضرت زید کو سپردِ خاک کیا جاچکا تو انہوں نے نہایت حسرت سے کہا کہ دیکھو علم اس طرح جاتا ہے، آج علم کا بڑا حصّہ دفن ہو گیا۔

حضرت زید بن ثابتؓ کا علمی مرتبہ

سلیمان بن یسار کا بیان ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما، فتاویٰ، فرائض اور قراءت کے معاملے میں زید بن ثابت کو سب سے مقدّم رکھتے تھے۔ مسروق کہتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو

دیکھا کہ حضرت زید بن ثابت کا شمار 'راسخین فی العلم' میں ہوتا ہے۔ امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ مدینہ کے لوگوں کے امام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد ہمارے نزدیک حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے، ان کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ مقام حاصل تھا۔ امام شافعیؒ فرائض کے تمام مسائل میں حضرت زیدؓ کی تقلید کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کو قرآن پاک سنانے اور ان سے قرآنی علوم سیکھنے والوں میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبدالرحمٰن سلمی جیسی ہستیاں بھی شامل ہیں۔ آپ سے تفسیری اقوال بھی منقول ہیں۔ شعبی کا بیان ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ سواری پر سوار ہونے جارہے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آگے بڑھ کر رکاب تھام لی۔ حضرت زیدؓ نے فرمایا کہ اے ابن عم رسول! یہ آپ کا کام نہیں، آپ میرے لیے واجب الاحترام ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جواب دیا کہ نہیں، علماء اور اکابر دین کی یہی شان ہے کہ ان کی رکاب تھامی جائے۔ اس پر حضرت زیدؓ نے ان کا ہاتھ چوم لیا اور فرمایا کہ ہمیں بھی اپنے نبی ﷺ کے اہلِ بیت کا اسی طرح ادب کرنا چاہیے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن پاک کی جمع وتدوین ہے۔ مسیلمہ کذاب کے خلاف یمامہ کی خون ریز لڑائی میں بہت سے حُفّاظ کرام شہید ہو گئے اور خدشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں قرآن کریم کا کوئی حصّہ حُفّاظ کرام کے سینوں میں ہونے کی وجہ سے ضائع نہ ہوجائے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے توجہ دلانے اور اصرار کرنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ تمام لوگوں سے قرآن مجید کے جملہ لکھے ہوئے اجزاء جمع کر کے انہیں ایک مصحف کی صورت میں مدوّن کر دیں۔ حضرت زیدؓ کو پہلے تو یہ عظیم الشان ذِمّہ داری اٹھانے پر تامل ہوا، لیکن حضرت صِدّیق اکبرؓ کے ترغیب دلانے پر آپ اس کے لیے آمادہ ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ کی مدد کے لیے اصحابِ رسول کی ایک جماعت بھی مقرر کر دی۔ صحیح بخاری کے مطابق قرآن پاک کا یہ ایک ہی جلد میں لکھا ہوا نسخہ پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا اور ان کی شہادت کے بعد اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں آ گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مختلف مفتوحہ علاقوں کے لوگوں میں اختلافِ قراءت پیدا ہوا تو آپؓ نے حضرت حفصہؓ سے قرآن پاک کا یہ مصحف منگوا کر اس کی نقلیں کروائیں اور مختلف اسلامی صوبوں میں بھجوا دیں، ساتھ ساتھ اصلاحِ تلفّظ ایک ماہر قاری بھی بھیجا گیا۔ جن صحابہ نے مصحف کی نقل کا کام کیا، ان میں حضرت زید بن ثابتؓ بھی شامل تھے۔

تفسیر میں حضرت زید بن ثابتؓ کا مقام

اس کا اندازہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے بھی کیا جا سکتا ہے: ((اَفْرَضُ اُمَّتِیْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ)) ''میری اُمّت میں سب سے بڑھ کر فرائض (کا علم) جاننے والے زید بن ثابت ہیں''۔ فرائض کے علم میں مشکل ترین مسئلہ میراث کا ہے۔ قرآن کریم میں وصیت و میراث کے بڑے بڑے مسائل اجمالاً بیان کر دیے گئے ہیں' لیکن انسانی معاشرے میں اس حوالے سے عجیب و غریب صورتیں پیش آتی رہتی ہیں' ان کے حل کے لیے جہاں قرآن مجید کے احکامات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے' وہیں حضور ﷺ کے ارشادات اور کبارِ صحابہؓ کے قضایا اور فتاویٰ کو پیش نظر رکھنا بھی لازم ہے۔ علم الفرائض دراصل فقہ کی ہی ایک شاخ ہے اور حضرت زید بن ثابتؓ کو قرآن و حدیث' تفسیر اور فقہ سے اس قدر گہرا شغف تھا کہ علم الفرائض میں ان کو ایک خاص مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کا یہی فضل و کمال تھا کہ وہ عہدِ رسالت میں ہی مسند افتاء پر فائز ہو گئے تھے۔ حضرت عمر فاروق ؓ حضرت زید بن ثابت ؓ کی مدینہ میں موجودگی کو اہل مدینہ کے لیے لازم خیال کرتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ اہلِ مدینہ زید (کے علم) کے محتاج ہیں' کیونکہ جو شے ان کے پاس ہے' کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے حضرت زیدؓ کو مدینہ منورہ سے باہر کبھی کسی عہدے پر فائز نہیں فرمایا۔ جب حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے تو جابیہ کے مقام پر ہزاروں آدمیوں کے سامنے خطبہ دیا' جس میں فرمایا کہ جس کو فرائض کے بارے میں کوئی سوال کرنا ہو' وہ زید بن ثابتؓ کے پاس جائے۔

ابن سعد کے مطابق حضرت زیدؓ کو حساب میں بڑی دسترس تھی اور وہ حساب کے پیچیدہ سے پیچیدہ سوالات اور مسائل کو آناً فاناً حل کر دیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ جیسے جلیل القدر صحابی بھی حضرت زیدؓ سے بعض مسائل میں استفتاء کیا کرتے تھے۔ طبقات ابن سعد میں ان کا قول نقل کیا گیا ہے کہ زید خلافتِ فاروقی کے حبر (بہت بڑے عالم) تھے۔ حضرت سعید بن المسیّبؒ کو جب بھی کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ اسے حضرت زید بن ثابتؓ کے اجتہاد اور فیصلوں کی روشنی میں حل کیا کرتے تھے' اور فرمایا کرتے کہ زید بن ثابتؓ فیصلوں کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ قرآنی علوم اور تفسیر میں حضرت زیدؓ علم الفرائض کے علاوہ قراءت کے علم میں امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ امام شعبی کا کہنا ہے کہ (حضرت) زیدؓ فرائض کی طرح قراءۃ میں بھی

امتیازی شان رکھتے تھے۔ سیّد القُرّاء حضرت اُبی بن کعب انصاری ؓ کی زندگی میں حضرت زیدؓ کو پوری شہرت حاصل نہ ہو سکی' لیکن ان کی وفات کے بعد حضرت زید کو مرجعیت عامہ حاصل ہو گئی۔ چونکہ ان کی قراءت قریش کی قراءت کے مطابق تھی اس لیے اسے عالمِ اسلام میں قبولیت عامہ حاصل ہو گئی۔ آج دنیائے اسلام میں حضرت زید بن ثابتؓ کی قراءت ہی جاری و نافذ ہے۔

'تفقّہ فی الدّین' میں حضرت زید بن ثابتؓ نہایت بلند مقام کے حامل تھے اور ان کا شمار مجتہدین صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ انہیں عہد رسالت میں بھی فتویٰ دینے کا شرف حاصل ہے' بعد میں بھی آپ مسند افتاء پر فائز رہے۔ اہلِ سیر کا بیان ہے کہ ان کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ حضرت سعید بن المسیّبؒ کا کہنا تھا کہ حضرت زید بن ثابتؓ کا کوئی قول ایسا نہیں جس پر لوگوں نے بالاجماع عمل نہ کیا ہو۔ حضرت زیدؓ ان چار صحابہ میں سے ایک ہیں جن کی بدولت علم فقہ کو ہمہ گیر شہرت اور وسعت نصیب ہوئی' دوسرے تین صحابہ کرامؓ میں حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا شمار ہوتا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کو حضرت ابن عباسؓ اُن علماء میں شمار کرتے تھے جنہیں کلام اللہ میں 'راسخین فی العلم' کہا گیا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جب دیوان قائم کیے اور لوگوں کے اُن کے درجے کے مطابق وظائف مقرر کیے' تو وظیفہ کی مقدار اور اس کے مستحق تمام لوگوں کی فہرست حضرت زیدؓ نے ہی تیار کی۔ تبلیغ و ارشاد کے لیے حضرت زید بن ثابتؓ حاکمانِ وقت کے پاس بھی تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ مروان والیٔ مدینہ کے گھر سے نکلے تو شاگردوں نے پوچھا کہ آپ مروان کے گھر کیسے تشریف لے گئے تھے؟ فرمایا کہ اس نے چند حدیثیں پوچھی تھیں (یعنی ان کے متعلق سوال کیا تھا)۔ مَیں نے اس کو بتایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں جو کہ مسلمان کے قلب کو زندہ رکھتی ہیں' اوّل ہر کام میں رضائے الٰہی کو مدِّنظر رکھنا' دوم حکام و امراء کو نصیحت کرنا' سوم جماعت (مسلمین) کے ساتھ رہنا۔ باقی ماندہ صحابہ کرامؓ اگرچہ تفسیر میں مشہور تھے مگر ان سے بہت کم تفسیری اقوال منقول ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال کی اہمیت

محدّث حاکمؒ نے ''المستدرک'' میں لکھا ہے کہ جو صحابی نزولِ وحی کے وقت موجود ہو' اُس کی (متعلقہ) تفسیر حدیثِ مرفوع کا درجہ رکھتی ہے۔ بقول حاکم' امام بخاری اور امام مسلم کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے۔ امام حاکم تحریر کرتے ہیں کہ حدیث کا طالب علم آگاہ رہے کہ جو صحابی نزولِ وحی

کے وقت موجود ہو‘ اس کی تفسیر شیخین (امام بخاری و مسلم) کے نزدیک مرفوع حدیث کا درجہ رکھتی ہے (تدریب الراوی)۔ محدّث ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ یہ اسبابِ نزول یا ان اُمور کے بارے میں ہے جن میں عقلِ انسانی کو بالکل دخل نہیں۔ چنانچہ ابن الصلاح ''مقدّمہ'' میں رقمطراز ہیں کہ یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ صحابی کی تفسیر حدیث مرفوع کا درجہ رکھتی ہے‘ یہ علی الاطلاق نہیں‘ بلکہ اس تفسیر کے بارے میں ہے جس کا تعلق کسی آیت کے سببِ نزول کے ساتھ ہو یا کسی ایسی بات کے سلسلے میں ہو جو نبی کریم ﷺ کے سوا کسی اور سے اَخذ نہ کی جاسکتی ہو اور اس میں انسانی عقل کو بھی کوئی دخل نہ ہو۔ جہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دیگر ایسے تفسیری اقوال کا تعلق ہے جن کو آنحضرت ﷺ کی جانب منسوب نہ کیا گیا ہو تو ان کو موقوف ہی قرار دیا جائے گا نہ کہ مرفوع۔ گویا صحابی کی تفسیر جب اسبابِ نزول یا ایسے اُمور سے متعلق ہو جس میں عقل انسانی کو دخل نہیں‘ تو وہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہوگی۔ جس تفسیر میں عقل انسانی کو دخل ہو اور اس کو صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ کی طرف منسوب بھی نہ کیا ہو‘ تو اسے موقوف قرار دیا جائے گا۔ صحابی کی مرفوع روایت کو کسی صورت ردّ نہیں کیا جاسکتا‘ لہٰذا مفسّر پر اب لازم ہے کہ اس سے اِستناد کرے اور کسی صورت بھی اِنحراف نہ کرے۔

اصحابِ رسولؐ کے اپنے تفسیری اقوال کے بارے میں علماء کے مختلف نظریات ہیں۔ غالب گروہ کے نزدیک صحابۂ کرامؓ کے تفسیری اقوال قابلِ حُجّت ہیں۔ غالب امکان ہے کہ انہوں نے حضور اقدس ﷺ سے سن کر وہ تفسیر بیان کی ہو‘ تو ان کی رائے اور قول بدرجہا بہتر اور اولیٰ ہے کہ وہ صحابیت کا شرف‘ صحبتِ نبوی سے مستفیض اور اہلِ زبان ہونے کے اعتبار سے کلامُ اللہ کا بہتر علم و فہم رکھتے ہیں۔ ساری اُمّتِ مُسلمہ پر ان کو سب سے بڑھ کر فضیلت حاصل ہے۔ انہوں نے قرآن نازل ہونے کے حالات و واقعات کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا اور متعلقہ سارا منظر ان کے سامنے تھا۔ خصوصاً خلفائے راشدین اور کبائر صحابہ کو علومِ قرآنی میں بصیرتِ تامّہ حاصل تھی۔ تو ان کے اقوال اور آراء کو پھر کیسے قبول نہ کیا جائے۔ امام زرکشی ''البُرہان'' میں تحریر کرتے ہیں کہ قرآن کی دو قسمیں ہیں: (ا) قرآن کا وہ حصّہ جس کی تفسیر رسول کریم ﷺ اور صحابہؓ سے منقول ہو۔ (ب) قرآن کا وہ حصّہ جس کی تفسیر آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے منقول و ماثور نہیں۔ پہلی قسم پھر دو حصوں میں منقسم ہے: (i) وہ تفسیر جو حضور ﷺ سے منقول ہو۔ (ii) وہ تفسیر جو صحابہؓ سے مروی ہو۔

اب وہ تفسیر جو حضور ﷺ سے منقول ہے‘ اس کی سند سے بحث کی جائے گی کہ آیا وہ صحیح ہے یا نہیں‘ پھر اس کے مطابق عمل ہوگا۔ اور وہ تفسیر جو صحابہؓ سے مروی ہو‘ تو اس میں دیکھیں گے کہ اگر وہ لغت کے اعتبار سے تفسیر کریں یا ان اسباب و قرائن کی بنا پر جو بچشمِ خود انہوں نے مشاہدہ کیے ہوں‘ تو ایسی تفسیر پر بلا شک و تردّد اعتبار اور عمل کیا جائے گا۔ مشہور مفسّر علّامہ ابن کثیر اپنی تفسیر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ جب کسی آیت کی تفسیر ہمیں کتاب و سُنّت میں نہ ملے تو ہم اقوالِ صحابہؓ کی طرف رجوع کریں گے۔ چونکہ انہوں نے نزولِ قرآن کے احوال و قرائن بچشمِ خود ملاحظہ (مشاہدہ) کیے تھے اس لیے وہ قرآن کی تفسیر ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ ان میں فہم کامل‘ علمِ صحیح اور عملِ صالح پایا جاتا تھا‘ خصوصاً ان کے اکابر مثلاً خلفائے راشدین اور اہلِ علم صحابہؓ جیسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ‘ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین۔

صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال کے حوالے سے چند امور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

(ا) صحابہ کرامؓ کے اقوال میں بھی صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات پائی جاتی ہیں۔ اس لیے ان تفسیری اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے اور حکم لگانے سے قبل اصولِ حدیث کے مطابق ان کی جانچ پڑتال ضروری ہے۔

(ب) صحابہ کرامؓ کے یہ اقوال اُس وقت حُجّت ہوں گے جبکہ آنحضرت ﷺ سے متعلقہ آیت کی کوئی صریح تفسیر مستند طریقے سے ثابت نہ ہو۔ اگر آپؐ کی فرمودہ کوئی تفسیر صحیح احادیث میں منقول ہو تو اصحابِ رسولؐ کے اقوال کی حیثیت محض تائیدی ہوگی۔ اگر کوئی ایسا قول حضور ﷺ کی ارشاد کردہ تفسیر کے معارض ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

(ج) جہاں حضورِ اقدس ﷺ سے کوئی تفسیر مستند روایات سے ثابت نہ ہو اور صحابہ کرامؓ کی بیان کردہ تفاسیر میں کوئی خاص اختلاف نہ ہو‘ تو پھر اقوالِ صحابہ کو ہی اختیار کیا جائے گا۔

(د) جہاں کہیں صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال میں کوئی اختلاف ہو‘ وہاں پہلے تو یہ دیکھا جائے گا کہ آیا ان مختلف اقوال میں کوئی ہم آہنگی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اگر تو ہم آہنگی ہوسکتی ہو تو پھر اسی پر عمل کیا جائے گا۔ اور اگر اختلاف ناقابلِ تطبیق ہو تو پھر ایک مجتہد جس تفسیری قول کو دلائل کے لحاظ سے زیادہ مضبوط پائے‘ اسے اختیار کرنے میں آزاد ہے۔

❁❁❁

Aug 2021
Vol.70

Regd. CPL No.115
No.8

Monthly Meesaq Lahore

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

QURAN COLLEGE FOR BOYS
191-A ATATRUK BLOCK, NEW GARDEN TOWN, LAHORE.

میٹرک پاس یا میٹرک کے امتحانات سے فارغ طلبہ کے لیے
ایف اے (آئی کام۔جنرل سائنس گروپ) میں

داخلے شروع

داخلہ لینے والے طلبہ کو اضافی طور پر ترجمہ قرآن (مکمل) حدیث، فقہ
ابتدائی صرف ونحو اور عقائد پر مشتمل دو سالہ کورس "دراسات دینیہ" بھی کروایا جائے گا۔

- پہلے آئیے پہلے پائیے کی بنیاد پر داخلے جاری ہیں۔
- کلاسز کا باقاعدہ آغاز 18۔اگست 2021ء سے کر دیا جائے گا۔
- ہوسٹل میں رہائش کے لیے محدود نشستیں موجود۔
- تجربہ کار اساتذہ کی نگرانی میں معیاری تعلیم۔

برائے معلومات ورابطہ فون:
042-35833637
0301-4882395 واٹس ایپ نمبر

ریاض اسماعیل ایم اے (انگلش)
پرنسپل